پروفیسر یوسف سرمست کی تنقید نگاری

مقالہ

برائے ایم۔فل (اردو)

۲۰۱۷ء

مقالہ نگار

نظیر احمد گنائی

ایم۔اے

نگران

ڈاکٹر عرشیہ جبین

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو

شعبہ اردو، اسکول آف ہیومانٹیز

یونیورسٹی آف حیدرآباد

حیدرآباد۔۴۶

CRITICAL STUDY OF PROF. YOUSUF SARMAST

Dessertation

A Dissertation Submitted to the University of Hyderabad, in partial fulfilment of the requirements for the award of the degree of

Master of Philosophy

in URDU

Submitted by

Nazir Ahmad Ganai

M.A.

Under the supervision of

Dr. Arshia Jabeen

Asst. Professor, Deptt of Urdu

Department of Urdu

School of Humanities, University of Hyderabad.

Hyderabad - 46

2017

Department of Urdu,
School of Humanities,
University of Hyderabad.
Hyderabad - 500 046.

Dt.........................

CERTIFICATE

This is to certify that the dissertation entitled **"Prof. YOUSUF SARMAST KI TANQEED NIGAARI"** submitted by **Nazir Ahmad Ganai** bearing Reg. No. 16HUHL13 in partial fulfillment of the requirments for the award of degree **Master of Philosophy in Urdu** is a bonafide work carried out by him under my supervision and guidance.

The dissertation has not been submitted previously in part or in full to this or any other University or Institution for the award of any Degree or Diploma.

(Signature of the Supervisor)
Dr. Arshia Jabeen

Counter Signature

Head Dept. of Urdu

Dean, School of Humanities

DECLARATION

I **NAZIR AHMAD GANAI** hereby declare that this Thesis entitled **"Prof. Yousuf Sarmast ki Tanqeed Nigaari"** submitted by me under the guidance and supervision of **Dr. ARSHIA JABEEN** is a bonafide research work which is also free from plagiarism. I also declare that it has not been submitted previously in part or in full to this University or any other University or Institution for the award of any degree or diploma. I hereby agree that my thesis can be deposited in Shodhganga/INFLIBNET.

Date: Name: **NAZIR AHMAD GANAI**

Signature of Student:
Regd. No.:**16HUHL13**

(Signature of the Supervisor) *(Counter Signature)*

فہرست

پیش لفظ	02
باب اول	
پروفیسر یوسف سرمست کے حالات زندگی اور شخصیت	06
(الف) حالات زندگی	
(ب) شخصیت	
باب دوم	
پروفیسر یوسف سرمست کے معاصر تنقید نگار (حیدر آباد دکن کے حوالے سے)	50
باب سوم	
پروفیسر یوسف سرمست کی تنقید نگاری	73
مجموعی جائزہ	156
کتابیات	163

پیش لفظ

ادباً میں شانِ خداوندی کا بے حد شکر گزار ہوں کہ مجھے وادئ اولیاء کی سرزمین میں پیدا کیا۔ کشمیر جو کہ صدیوں سے صوفیوں، بزرگوں اور دانشوروں کی تہذیب کا مسکن رہا ہے۔ مجھے بھی یہاں کے علم و ادب سے جو روشنی حاصل ہوئی ہے اسی کا پھل آج میرے ہاتھوں میں ہے کہ میں اپنا تحقیقی مقالہ داخل کر رہا ہوں۔

ادب میں تنقید کی کارفرمائی اسی وقت شروع ہو جاتی ہے جب فن کار کے ذہن میں کسی فن پارے کی داغ بیل پڑنے لگتی ہے۔ گویا تخلیقی عمل کے ساتھ ساتھ تنقیدی عمل بھی شروع ہو جاتا ہے۔ اسی حوالے سے میری نگران نے مجھے پروفیسر یوسف سرمست کی تنقید نگاری پر کام کرنے کا مشورہ دیا۔ بعد میں شعبے کے دیگر اساتذہ کی منظوری سے میرے مقالے کا موضوع ''پروفیسر یوسف سرمست کی تنقید نگاری'' طے پایا۔

پروفیسر یوسف سرمست بیسویں صدی کے ناقدین میں ایک اہم نام ہے۔ جنھوں نے تنقید اور نقاد کے حقیقی اصول سمجھ کر انصاف کی ترازو سے اپنا فریضہ انجام دیا ہے۔ وہ ایک محقق، نقاد اور مضمون نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ اردو ناول پر تنقید کی دنیا میں ایک اہم مرتبہ رکھتے ہیں۔ ناول کی پرکھ، شناخت اور قدر متعین کرنے میں وہ اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ وہ ہند پاک کے دورِ حاضر کے ناقدین میں بھی اہم مقام رکھتے ہیں۔

یہ مقالہ تین ابواب میں منقسم ہے۔

باب اول ''پروفیسر یوسف سرمست کے حالاتِ زندگی اور شخصیت'' کے عنوان کے تحت ہے۔ اس

باب میں یوسف سرمست کے حالات زندگی کو پیش کرتے ہوئے ان کی شخصیت کے پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے۔

باب دوم ''پروفیسر یوسف سرمست کے معاصر تنقید نگار حیدر آباد دکن کے حوالے سے'' کے عنوان کے تحت ہے۔ اس باب میں ان کے معاصر چند اہم محققین و ناقدین کا مختصر تعارف پیش کیا گیا ہے تا کہ اس عہد کے تنقید نگاری کا اندازہ کیا جا سکے۔

باب سوم ''پروفیسر یوسف سرمست کی تنقید نگاری'' کے عنوان سے رکھا گیا ہے۔ اس باب کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک نظریاتی تنقید اور دوسرا عملی تنقید۔ اس طرح ان عنوانات کے تحت ان کی نظریاتی اور عملی تنقید کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

سب سے پہلے میرا ضمیر یہ لکھنے کی ضد کر رہا ہے کہ اپنے والد جناب غلام حسن گنائی اور پیاری والدہ حسینہ اختر کا شکریہ ادا کروں گا کہ جنہوں نے نہایت محبت و شفقت سے مجھے پڑھایا۔ اللہ رب العزت انہیں عزت و صحت کی دولت سے مالا مال کرے اور ان کا سایہ مجھ پر ہمیشہ برقرار رکھے۔ اس کے علاوہ میں اپنے بھائی عمر حسن گنائی اور بہن جمیلہ اختر کا بھی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے ہمیشہ میرا ساتھ دیا اور میری حوصلہ افزائی کی۔

میں اپنی نگران محترمہ ڈاکٹر عرشیہ جبین صاحبہ کا صمیم قلب سے نہایت ہی مشکور و ممنون ہوں جنہوں نے موضوع کے انتخاب سے لے کر مقالہ تیار ہونے تک میری رہنمائی کی۔ ان کا ہمدردانہ اور مخلصانہ سلوک ہر وقت میرے ساتھ رہا ہے۔ میں اپنے شعبے کے صدر پروفیسر حبیب نثار کا بھی بے حد شکر گزار ہوں کہ انہوں نے وقتاً فوقتاً علمی مشوروں سے نوازا۔ میں شعبے کے دیگر اساتذہ کا بھی شکریہ ادا کرنا اپنا اخلاقی فرض سمجھتا ہوں جن میں ڈاکٹر نشاط احمد، ڈاکٹر عبدالرب منظر، ڈاکٹر کاشف، ڈاکٹر زاہد الحق اور ڈاکٹر رفیعہ بیگم صاحبہ شامل ہیں۔

میں اپنے شعبے کے سابق صدر پروفیسر مظفر علی شہ میری کا بھی تہہ دل سے شکر گزار ہوں جنہوں نے دورانِ تدریس طریقۂ تحقیق اور عملی تنقید کے حوالے سے تشفی بخش معلومات فراہم کیں۔ اگر میں اپنے سینئر

احباب محمد خوشتر اور بلال احمد میر کا شکریہ ادا نہ کروں تو ناسپاسی ہوگی۔ انہوں نے اپنا قیمتی وقت صرف کر کے میرے تحقیقی کام میں تعاون کیا۔ میں اپنے ساتھیوں میں رئیس احمد بانڈرو، سبزار احمد، یاور گلزار، پرکاش راج اور افروزہ مجید کا بھی تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے ہر قدم پر میرا ساتھ دیا۔

شکریہ

نظیر احمد گنائی

۲۰۱۷ء

باب اول

حالات زندگی اور شخصیت

(الف) حالات زندگی

(ب) شخصیت

(الف)   حالات زندگی

خاندانی پس منظر

یوسف سرمست کے دادا نواب سید مسیح الدین امیر پائیگاہ نواب معین الدولہ بہادر کے حقیقی ماموں تھے۔ وہ حکومت نظام میں بخشی[1] کے عہدے پر فائز تھے چونکہ اپنے ہم رتبہ احباب میں ذی مرتبہ اور معمر تھے اس بنا پر بڑے بخشی کی عرفیت سے جانے جاتے تھے۔ نواب مسیح الدین خان کے بڑے بخشی کہلانے کی ایک اہم وجہ یہ بھی تھی کہ جس وقت نواب معین الدولہ بہادر کے والد نے انتقال کیا وہ صرف بارہ یا تیرہ برس کے تھے چنانچہ ان کے ماموں نواب سید مسیح الدین خان نے پائیگاہ کا سارا انتظام اپنے ذمہ لیا اور بہتر انداز میں اس کی دیکھ بھال کی تھی۔ اسی بناء پر انہیں بڑے بخشی کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ مالک رام ''تذکرہ معاصرین'' میں تمکین سرمست کے تعلق سے لکھتے ہیں:

> ''ان کے والد نواب سید مسیح الدین خان ریاست نظام کے منصب دار تھے۔ وہ عوام میں 'بڑے بخشی' کے عرف سے مشہور تھے۔ حیدر آباد کے محلّہ مغلپورہ میں مسیح الدین خان کی دیوڑھی انہیں سے منسوب ہے۔ نواب معین الدولہ ان کے حقیقی بھانجے تھے۔ جب معین الدولہ کی کم عمری میں ان کے والد کا انتقال ہوگیا تو ''جاگیر'' کورٹ آف وارڈ کی تحویل میں چلی گئی اور حضور نظام نے نواب مسیح

---

[1] سرکار کی طرف سے ایک عہدہ تھا، سرکاری رقومات تقسیم کرنے والے ''بڑے بخشی'' کہلاتے تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی ''چھوٹے بخشی'' کہلاتے تھے۔

الدین خان کو معین الدولہ کا ولی اور نگران مقرر کر دیا۔'' [1]

ڈاکٹر یوسف سرمست کے چھوٹے بھائی قیصر سرمست بھی اپنے ایک مضمون میں اس تعلق سے لکھتے ہیں:

''امیر پائیگاہ آسمان جاہی نواب معین الدولہ بہادر آپ کے والد آسمان جاہ (بشیر الدولہ) کا جب انتقال ہوا۔ اس وقت نواب صاحب کی عمر بمشکل بارہ یا تیرہ سال تھی اور پائیگاہ آسمان جاہی چھوٹی سی ریاست کو سنبھالنا بے حد مشکل اور دشوار تھا۔ اس بات کو پیش نظر رکھ کر مرحوم نظام میر محبوب علی خان بہادر نے نواب معین الدولہ بہادر کے حقیقی ماموں نواب سید مسیح الدین خان بڑے بخشی صاحب جو نواب سید محمد قادر الدین المعروف حضرت تمکین سرمست قبلہ کے والد اور خاکسار اور ڈاکٹر یوسف سرمست کے حقیقی دادا کو پائیگاہ کا ٹرسٹی اور نگران مقرر فرمایا تھا۔'' [2]

یوسف سرمست کے مطابق اس وقت جو منصب دار یا جاگیر دار ہوتے تھے وہ اپنے نام کے آگے ''نواب'' لکھا کرتے تھے اور اس طرح ان کا خاندانی نام نواب مسیح الدین خان تھا خان ان کا خطابی نام ہوا کرتا تھا۔ ان کے پہلی بیوی امت اللہ بیگم (یوسف سرمست کی دادی) سے انہیں کل آٹھ اولادیں ہوئیں جن میں پانچ بیٹے یعنی سید ہدایت محی الدین، سید عبدالقادر، سید دستگیر الدین، سید قادر الدین اور سید سلطان محی الدین اور تین بیٹیاں لاڈلی بیگم، قادری بیگم، جیلانی بیگم ہیں۔ نواب مسیح الدین خان کی دوسری بیوی سے انہیں صرف ایک لڑکا عبدالرزاق ہے۔ ان کے دادا نے اپنی تمام اولادوں کے نام غوث اعظمؒ کے نام پر کیوں رکھے پوچھے جانے پر یوسف سرمست نے بتایا کہ:

---

[1] مالک رام ''تذکرۂ معاصرین'' جلد سوم، ص: ۳۳۷

[2] بحوالہ روزنامہ ''اعتماد'' مورخہ ۸/نومبر ۲۰۰۹ء۔ اتوار،

''میرے دادا حضرت پیرانِ پیر غوث اعظم دستگیرؒ کے بے حد معتقد تھے۔اس لیے تمام بیٹوں اور بیٹیوں کے نام غوث پاکؒ کے نام پر رکھے تھے۔''[1]

نواب مسیح الدین خان بڑے بخشی نے اپنی اولاد کو اپنے زمانے کے مروجہ تعلیمی نظام کے تحت تعلیم دلائی تھی۔ یہ وہ دور تھا جب سرزمین دکن پر نواب میر محبوب علی خان کی حکومت تھی۔امن وامان کا ماحول تھا اور ہر طرف خوش گواری تھی۔گھر گھر شاعری کا بول بالا تھا۔دکن کی خواتین شعروسخن میں اپنا کمال رکھتی تھیں۔نواب سید مسیح الدین خان بڑے بخشی کے تین صاحبزادوں نے بھی شعروشاعری سے رغبت حاصل کی۔ چنانچہ نواب عبدالقادر نے ناصر تخلص اختیار کیا۔نواب قادر الدین خان نے تمکین سرمست تخلص اختیار کیا اور نواب سلطان محی الدین خان نے نسیم قاسمی تخلص کے ساتھ شاعری کرنے لگے۔ مالک رام شعروشاعری اور سخن سنجی وسخن فہمی کو اس عہد کی علمی ضوفشانی سے تعبیر کرتے تھے اور نواب مسیح الدین کے ان صاحبزاروں کے بارے میں لکھتے ہیں:

''سید قادر الدین خان کو بچپن ہی سے ادبی ماحول ملا۔ والد اگر چہ شعر نہیں کہتے تھے لیکن ان کا ادبی ذوق بہت بلند تھا جیسا کہ اس عہد کے اکثر روسا کے یہاں ملتا ہے۔قادر الدین کے تین بھائی شعر کہتے تھے۔سید عبدالقادر کا تخلص ناصر تھا۔ان سے چھوٹے سید دستگیر الدین نادر تخلص کرتے تھے۔ ڈرامہ نویسی سے بھی دلچسپی تھی۔سید قادر الدین سے چھوٹے بھائی سلطان محی الدین بھی شعر کہتے اور قاسمی تخلص کرتے تھے۔''[2]

سید ہدایت محی الدین پلیگ جیسی موذی وبا کا شکار ہوئے اور انتقال کرگئے۔سید عبدالقادر خان

---

[1] شخصی انٹرویو، کنعان۔۱۱، جوبلی ہلز، جرنلسٹ کالونی، حیدرآباد، ۲۵ جنوری ۲۰۱۷ء

[2] شخصی انٹرویو پروفیسر یوسف سرمست، کنعان۔۱۱، جوبلی ہلز، جرنلسٹ کالونی، حیدرآباد، ۲۵/جنوری ۲۰۱۷ء

پائیگاہ آسمان جاہی میں اول تعلقدار تھے۔ تحصیل داری کی ٹریننگ شمس آباد میں حاصل کی تھی۔ ضلع بشیر آباد (ناوندگ) میں تحصیل داری پر مامور تھے۔ وہاں سے تبادلہ پر دوبلگنڈی گئے۔ اس کے بعد چیتا پور میں تحصیل داری کے فرائض انجام دیئے۔ وہ ایک اچھے شاعر تھے، ناصرؔ تخلص کرتے تھے۔ داغؔ دہلوی کے رنگ تغزل کے شیدا تھے۔

آخر یکم اپریل ۱۹۶۹ء کو وہ مغلپورہ کے آبائی مکان میں انتقال کر گئے۔ ان کی چھ اولادوں میں ایک لڑکا اقبال متین ہے جو اردو افسانہ نگار کی حیثیت سے ادبی دنیا میں محتاج تعارف نہیں ہے۔

سید دستگیر الدین خان جو ''نادرؔ'' تخلص کرتے تھے، بڑے باوضع و باسلیقہ آدمی تھے۔ ڈرامے لکھتے اور انہیں اسٹیج پر پیش بھی کرتے تھے۔ ان کے اسٹیج پر کھیلے گئے ڈراموں کو کافی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔ سید دستگیر الدین خان نادرؔ جتنے مقبول ڈرامہ نگار تھے۔ اتنے ہی اچھے شاعر بھی تھے۔

والد

یوسف سرمست کے والد کا نام نواب سید قادر الدین خان ہے وہ بڑے بخشی نواب مسیح الدین خان کے چوتھے صاحبزادے تھے۔ وہ ۱۹۰۳ء میں دیوڑھی بشیر الدولہ، بشیر باغ میں پیدا ہوئے۔ بچپن بڑے لاڈ و پیار اور ناز و نغم میں گزارا۔ چار برس کی عمر سے ہی ان کی تعلیم کا آغاز ہوا۔ اپنے وقت کے بہترین معلمین کا تقرر ان کی تعلیم و تربیت کے لیے کیا گیا۔ سید قادر الدین کی تمام تر تعلیم گھر ہی پر ہوئی۔ اس سلسلے میں مالک رام ''تذکرۂ معاصرین'' میں لکھتے ہیں:

> ''سید قادر الدین کی پوری تعلیم گھر پر ہوئی۔ کبھی مدرسے نہیں گئے۔ فارسی میں پوری دستگاہ تھی۔ انگریزی بھی بقدر ضرورت حاصل کر لی تھی۔ مطالعہ بہت وسیع تھا۔ انہوں نے اس سے پورا استفادہ کیا۔ خود بھی کتابوں کا ذخیرہ جمع کیا تھا۔ اپنے ماحول کے اثر سے جلد ہی شعر کہنے لگے۔ تمکینؔ تخلص تھا ''سرمست'' کا اضافہ اپنے کسی صوفی

بزرگ کے لقب سے کرایا تھا۔''[1]

سید قادرالدین کو جب شعر کہنے کا شوق ہوا اور تھوڑی بہت مشق مبہم پہنچائی تو انہیں احساس ہوا کہ کسی استاد کے آگے زانوے ادب طے کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ انہوں نے شعر وسخن کی ابتدائی مشق کے زمانے میں ترک علی شاہ ترکی سے اپنے کلام پر اصلاح لی اوران کے انتقال کے بعد نظم طباطبائی سے فیض اٹھایا۔ تمکین سرمست نے نعت ومنقبت بھی کہی ہے اور غزل ونظم بھی۔ بیسویں صدی کی ابتداء میں حیدرآباد کی ادبی محفلوں میں نعت گوئی نے عروج حاصل کیا تھا۔ حضرت شائق اور حضرت بندؔہ کی نعت گوئی کی شہرت تھی جبکہ حضرت امجدؔ حیدرآبادی کی رباعیوں میں نعت اور منقبتی مضامین کا چرچا تھا۔ اس ماحول میں تمکینؔ سرمست نے بھی اپنی نعت ومنقبت پیش کی جس میں ان کی عقیدت، انکساری اور خلوص نے ایک انفرادی کیفیت پیدا کردی ہے۔ حمد ونعت ومنقبت کے چند اشعار بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں۔

'' نگاہوں کی فریاد آنکھوں کے نالے
کلیجوں کے ناسور سینوں کے چھالے
دلوں کے عمیق اور ان سوز آئے
یہ لایا ہوں نذرانہ اور کملی والے

کہ تیرے غریبوں کی پونجی یہی ہے
بہت غریب نوازی کا تیری چرچا ہے
مگر غریب ترستا تھا اور ترستا ہے
قصور گریہ غریبوں کے بخت بدکا ہے
بدل دے مرضی مولا بھی دیکھتا کیا ہے
دکھا غریب نوازی کی شان اے خواجہ'' [2]

---

[1] مالک رام، تذکرۂ معاصرین، جلد سوم، ص: ۳۳۸

[2] تمکین سرمست ''سرمستی تمکینؔ''، مرتبہ قیصر مسرت۔ ۱۹۹۸ء، ص: ۲۸

تمکینؔ سرمست نے حمد،نعت ومنقبت کے علاوہ غزل اور رباعی میں بھی طبع آزمائی کی ہے اور عصری تقاضوں کے مطابق نظمیں بھی کہی ہیں۔ایک رباعی ملاحظہ ہو:

ہر قوتِ دل کو آزما کر دیکھا
اک اک بت کو خدا بنا کر دیکھا
تمکینؔ! مگر بھولنے والا میرا
بھولا نہ گیا لاکھ بھلا کر دیکھا

چند منتخب اشعار ملاحظہ ہو:

ذرا جوشِ جنوں، دردِ محبت اور بڑھنے دو
یہ داماں خود بتائیں گے، گریبانوں پہ کیا گزری
جو کچھ بیتی مجھ پر، لیکن کیا کہوں تمکینؔ
مرے ضبطِ مسلسل سے ستم رانوں پہ کیا گزری

تمکینؔ سرمست نے نظمیں بھی لکھی ہیں۔ان کی بیشتر نگارشات اپنے وقت کے مشہور زمانہ رسالہ ''نگار'' لکھنو میں شائع ہوئیں جسے نیاز فتح پوری شائع کرتے تھے۔ان نظموں کی اشاعت کی بناء پر انہیں ملک گیر شہرت نصیب ہوئی وہ نظمیں جو ''نگار'' میں شائع ہوئیں وہ ''تلاش''، ''آنکھ مچولی''، ''بے خودی''، ''بازگشت''، ''محبت''، ''اعترافِ شکست'' اور ''مفلس کی دنیا'' ہیں۔

تمکینؔ سرمست اکثر مشاعروں میں بھی حصہ لیا کرتے تھے۔خاص طور پر ''چیتا پور'' کے سالانہ مشاعرہ میں شرکت کرنا ان کا معمول تھا۔اس کی تفصیل یوسف سرمست نے ایک انٹرویو میں یوں بتاتی ہے:

''تانڈور سے دو تین اسٹیشن کے بعد ایک علاقہ ہے ''چیتا پور'' جہاں ہر سال ''چیتا شاہ ولی'' کا عرس ہوا کرتا تھا۔ وہاں کے تحصیل دار ہمارے تایا ''سید عبدالقادر'' تھے جو خود بھی ایک اچھے شاعر تھے اور

ناصؔر تخلص کرتے تھے۔ انہوں نے ہی عرس کے موقع پر سالانہ مشاعرہ کا سلسلہ شروع کیا جوانہیں سے شروع ہوااوران کے جانے کے بعد ختم ہوگیا جس میں حیدرآباد کے اس زمانے کے سبھی مشہور شعراء کو مدعو کیا جاتا تھا جیسے تمکینؔ سرمست، علی اخترؔ، صفیؔ اورنگ آبادی، نذیر دہتھانی، دہقانی (مزاحیہ شاعر)، علی میاں، صمد رضوی سازؔ، شاہد حسینیؔ (زینت ساجدہ کے شوہر) لطیفؔ ساجدہ وغیرہ۔''[1]

یوسف سرمست کے والد صاحب کی طبیعت میں اعتدال وتوازن تھا۔ وسنجیدہ مزاج تھے۔ اسلامی تعلیمات سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ وہ کمیونسٹ پارٹی میں کبھی شامل نہیں ہوئے تھے۔ لیکن اس تحریک سے بہت متاثر تھے۔ انہوں نے ایک نظم بھی غریب ومفلس لوگوں کی صورتحال پر لکھی ہے تمکین کاظمی نے ان کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

''والد محترم عجیب وغریب انسان واقع ہوئے تھے۔ ہر انسان کو زندگی میں خوشیوں اور غموں سے واسطہ پڑتا ہی ہے۔ بابا بھی ان کیفیات سے گزرتے رہے تھے۔ بے پناہ خوشی میں انہیں میں نے قہقہہ لگاتے نہیں دیکھا اور شدتِ غم میں دھاڑیں مار مار کر نہیں روئے...... جاگیرداروں اور منصب داروں میں اٹھنا بیٹھنا تھا اس کے باوجود کمیونزم کی جانب راغب تھے۔ سچ پوچھئے تو وہ صد فیصد اسلامی تعلیمات سے متاثر تھے۔ بابا نے خود کو کبھی کمیونسٹ نہیں کہلوایا اور نہ ہی اس تحریک کی شان میں قصیدے کہے۔ خود کو کمیونسٹ کہہ لینے یا کہلوانا ایک چیز ہے اور مزاجاً کمیونسٹ ہونا الگ بات ہے۔ ان کی حساس فطرت کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے ''مفلس کی

---

[1] شخصی انٹرویو، پروفیسر یوسف سرمست، کنعان۔II، جوبلی ہلز، حیدرآباد،۴ فروری، ۲۰۱۷ء

دنیا'' کا ایسا نقشہ کھینچا کہ نظم پڑھنے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم
نظم پڑھ رہے ہیں بلکہ ٹی وی پر ان نادار اور خدائی بھر کے ٹھکرائے
ہوئے انسانوں کی تیرہ تاریک دنیا کا نظارہ کر رہے ہیں۔''[1]

اس طرح تمکین سرمست کے تخلص کے ساتھ وہ شاعری کرنے لگے اور کئی نظمیں بھی لکھی جو اپنے زمانے کے معتبر رسائل میں شائع ہوتی تھیں۔ چنانچہ اقبال متین ''عرفان گزیدہ'' میں بڑے بخشی کے خاندان میں تمکین سرمست کی شاعرانہ حیثیت کا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''خاندان بھر میں شعر و ادب کی مسند پر کوئی متمکن تھا تو اپنی ساری
تمکنت کے ساتھ تمکین سرمست ہی تھے۔ تمکین سرمست کی نظمیں جو
''نگار'' میں چھپ چکی وہ یہ ہیں۔ ''بے خودی''، ''تلاش''،
''بازگشت''، ''محبت''، ''مفلس کی دنیا'' اور ''اعتراف شکست''[2]

تمکین سرمست نے دو شادیاں کی تھیں۔ پہلی بیوی بدر النساء تھیں جن کے بطن سے سید یوسف شریف الدین، سید قیصر صلاح الدین اور جمیلہ حامدہ النساء تولد ہوئیں۔ تمکین سرمست نے دوسری شادی محمدی بیگم سے کی تھی۔ ان سے کوئی اولاد نہ ہوئی۔

تمکینؔ سرمست اس حوالے سے کہتے ہیں:

''میری شادی صدیق علی شاہ (سابق تحصیل دار سہارن پور) کی
صاحبزادی بدر النساء بیگم سے ہوئی۔ وہ اردو، فارسی بہت اچھی جانتی
ہیں۔ شعر بھی کہتی ہیں۔ ''بیبیؔ'' تخلص ہے۔ مرحومہ سے دو بیٹے سید
یوسف شریف الدین (یوسف سرمست)، سید قیصر صلاح الدین
(عرف قیصر سرمست) اور ایک بیٹی جمیلہ حامدہ النساء بیگم یادگار

---

[1] قیصر سرمست، ''سرمستی تمکینؔ''، ص: ۷۔۸

[2] اقبال متین، ''سوندھی مٹی کے بت''، ۱۹۹۵ء ص: ۲۱۹۔۲۱۸

ہیں۔تینوں شادی شدہ ہیں اور صاحب اولاد بھی ہیں۔''[1]

تمکین سرمست اپنی پہلی بیوی بدر النساء بیگم سے بہت محبت کرتے تھے کیوں کہ وہ پڑھی لکھی خاتون تھیں اور شاعری بھی کرتی تھیں۔اقبال متین تمکین سرمست کی دونوں بیویوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بدر النساء بیگم ببنؔ جوان کی (تمکین سرمست) کی محبوبہ تھیں۔پھر شریک حیات ہوئیں۔پھر یوسف سرمست اور قیصر سرمست جیسے بیٹوں کی ماں بنیں۔۔۔۔تمکینؔ کی ایک اور بیوی تھیں نگینہ بیگم مرحوم۔ان کا انتقال تمکینؔ کی زندگی ہی میں ہوا۔تمکین کے ایک عشق نے طویل عمر پائی اور اس طویل عمری کا سبب ذہنی رفاقت تھی جس نے تمکین کے جسم سے زیادہ ان کے فکر و احساس کو آسودگی دی اور یہ سب کچھ نگینہ کی زندگی ہی میں ہوا۔نگینہ نے تمکین کی اس رفاقت کے بھی ناز اٹھائے اور ببنؔ کے بھی۔جو صاحب اولاد بیوی تھیں۔نگینہ اولاد کی نعمت سے محروم رہیں۔شاید اسی لیے وہ تمکین سرمست کی صرف بیوی نہ تھیں۔''[2]

اس طرح یہ پتہ چلا ہے کہ تمکین سرمست کی دو بیویاں تھیں۔پہلی بیوی بدر النساء ببنؔ (والدۂ یوسف) جسے انہوں نے اپنی پسند سے شادی کی تھی اور دوسری بیوی محمدی بیگم جنہیں ''نگینہ'' کہہ کر بلایا جاتا تھا جو حیدرآباد ہی کی خاتون تھیں اور لاولد تھیں۔اس سلسلے میں مزید وضاحت کرتے ہوئے یوسف سرمست صاحب اپنے انٹرویو میں کہتے ہیں:

''ایک مدت تک علیحدہ رہیں۔جب منصب وغیرہ جانے لگے تو

---

[1] ''تذکرۂ معاصرین''،بحوالہ،از مالک رام،جلد سوم:ص ۳۳۹

[2] اقبال متین،''سوندھی مٹی کے بت''،۱۹۹۵ء،ص:۲۲۱۔۲۲۰

ایک ہی گھر میں دونوں بیویاں رہنے لگیں۔ہم سے بہت محبت کرتی تھیں۔ہم انہیں ''خالہ اماں'' کہہ کر بلاتے تھے۔''

تمکین سرمست زندگی کے آخری زمانے میں اکثر بیمار رہا کرتے تھے۔ان کا انتقال ۱۲ دسمبر ۱۹۷۵ء کو ہوا۔

والدہ

یوسف سرمست کی والدہ کا نام بدرالنساء ہے۔ وہ ۱۹۱۰ء میں حیدرآباد میں پیدا ہوئیں۔عربی، فارسی اور اردو کی تعلیم گھر ہی پر حاصل کیں۔وہ شاعری کا اچھا خاصہ ذوق رکھتی تھیں،مطالعہ کا بھی شوق تھا۔ اس زمانے کے افسانوی ادب کا مطالعہ کرتی تھیں۔اعلیٰ درجہ کی مدرسانہ صفات بھی ان میں موجود تھیں۔ جہاں تک شاعری کا تعلق ہے صرف شوقیہ شاعری کرتی تھیں۔''غزل'' ان کی پسندیدہ صنف تھی اور بیبنؔ تخلص سے شاعری کرتی تھیں۔ان کا کلام کسی رسالے میں شائع نہیں ہوا۔وہ مشاعروں میں بھی شرکت نہیں کرتی تھیں۔ان کی غزل کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے۔

نہ دنیا کی خبر ہم کو نہ عقبیٰ کی خبر ہم کو
قفس کے ایک گوشے میں گزاری زندگی اپنی
کسی بے درد کے ہاتھوں چمن کی ایسی صورت ہے
گئی ایسی نہ آئی پھر بہار زندگی اپنی
نگاہِ ناز سے بے خود بنایا ایسا ساقی نے
کہ آئی ہے نظر، ان کی نظر میں زندگی اپنی
بساطِ عشق میں بیبنؔ عدو سے کیا مجھے کھٹکا
یہ بازی میں نے جیتی ہے لگا کر زندگی اپنی

بدرالنساء کی نہ صرف شاعری اچھی ہوتی بلکہ ان کی آواز بھی سریلی تھی اور جب وہ ترنم سے پڑھتی

تھیں بڑے تو بڑے بچے بھی کھیل کود بھول جایا کرتے تھے۔ چنانچہ اقبال متین اپنی چچی کے بارے میں اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

> ''میرے سارے ماحول میں شعر و ادب کی فضاء کچھ اس طرح رچ بس گئی تھی کہ گیند کو دیوار سے ٹکرا کر کیچ پکڑنے کے دوران ٹپا ٹپ کی سریلی آواز کے ساتھ ساتھ کانوں سے ٹکرانے والے ناموں میں جوشؔ، جگرؔ، حسرتؔ اور نیازؔ فتح پوری بھی ہوتے اور جب میں امی کو یہ کہتے ہوئے سنتا کہ چھوٹے صاحب (تمکین سرمست) ہم اس غزل کو بیبنؔ سے سنیں گے تو میری گیند اپنی ٹپا ٹپ بھول جاتی اور چچی صاحبہ کچھ شرما کر لجا کر سر پر پلو اوڑھ لیتی پھر ان کی آواز کا جادو ہمارے کھیل کھلونوں پر بھی حاوی ہو جاتا۔''[1]

بدرالنساء بیگم بہت اچھی والدہ تھیں۔ یوسف سرمست کی ابتدائی تعلیم انہیں کے زیر تربیت ہوئیں وہ اپنے بچوں سے بے پناہ محبت کرتی تھیں۔ ان کی تدریس کا انداز بھی مشفقانہ ہوتا۔ وہ اپنے بچوں کے ساتھ زیادہ سختی نہیں کرتی تھیں۔ یوسف سرمست اپنی والدہ کی شخصیت کے اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''وہ بچوں پر زیادہ سختی کرنے کی قائل نہیں تھیں۔ البتہ تعلیم کی طرف توجہ دیتی تھیں جبکہ کہا جاتا ہے کہ ''ماں کی گود بچہ کی پہلی درسگاہ'' ہوتی ہے۔ ہم بچوں نے بھی ابتداء میں اپنی ماں سے ہی پڑھا ہے۔ ہم اپنی والدہ کو ''امی'' اور والد کو ''بابا'' کہا کرتے تھے۔''[2]

سید قادرالدین خان تمکین سرمست کی شادی بدرالنساء سے ۱۹۳۰ء میں انجام پائی تھی۔ ان کی کل

---

۱ اقبال متین، ''عرفان گزیدہ''، ماہنامہ پونم، نومبر ۱۹۷۶ء ص: ۴

۲ شخصی انٹرویو، پروفیسر یوسف سرمست، کنعان۔II، جوبلی ہلز، جرنلسٹ کالونی، حیدرآباد، ۴ فروری ۲۰۱۷ء

تین اولادیں ہوئیں جن میں یوسف سرمست، قیصر سرمست اور لڑکی جمیل النساء ہیں۔

جمیل النساء کی تعلیم و تربیت گھر ہی پر کی گئی تھی۔ افسانے اور ناول وغیرہ ان کے زیر مطالعہ رہا کرتے تھے۔ اگر چہ اس وقت تک لڑکیوں کے لیے علیحدہ اسکول کھل چکے تھے اور لڑکیاں با قاعدہ چلمنیں لگی ہوئی گاڑیوں میں اسکول جایا کرتی تھیں۔

یوسف سرمست کہتے ہیں:

''ہمارے گھر کے بازار میں ایک بڑا سا اسکول تھا جو چھوٹے دادا یعنی چھوٹے بخشی کے حصے میں آیا تھا جو دیوڑھی مسیح الدین خان کہلاتی تھی۔ چھوٹے بخشی اس اسکول کی عمارت کا معائنہ کرنے آتے تو ہمارے ہاں بھی آتے اور بابا کو ڈانٹتے تھے کہ ''بغل میں اسکول ہے بچی کو کیوں نہیں پڑھاتے۔''[1]

غرض جمیل النساء کو اسکول نہ بھیجنے والی بات کی وضاحت میں یوسف سرمست کہتے ہیں:

''اس وقت تک بھی لڑکیوں کو باہر بھیجنا کچھ معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے جمیل النساء کی تعلیم کا انتظام گھر ہی پر کیا گیا۔''[2]

بھائی

یوسف سرمست کے چھوٹے بھائی قیصر صلاح الدین ہے۔ انہوں نے بی ایس سی تک تعلیم حاصل کی اور ایک پانچ سالہ کورس G.D.F.A گورنمنٹ ڈگری ان فائن آرٹس بھی کیا اور ایک پرائیوٹ کمپنی ''بایو ویژول کمپنی'' (جہاں زوالوجی، باٹنی، فزکس، کیمسٹری، میتھامیٹکس اور بیالوجی کے چارٹس، کالجس اور اسکولس کے لیے بنتے ہیں) میں ملازمت اختیار کرلی۔ تقریباً ۳۵ سال تک خدمات انجام دینے کے

---

۱ شخصی انٹرویو، پروفیسر یوسف سرمست، کنعان۔II، جوبلی ہلز، جرنلسٹ کالونی، حیدرآباد، ۱۷ فروری ۲۰۱۷ء

۲ ایضاً

بعد قبل از وقت وظیفہ لے لیا۔

اب تک نہ صرف سینکڑوں کتابوں اور رسائل کے سرورق کی پینٹنگ و ڈیزائننگ کی بلکہ وہ ادب سے بھی وابستہ رہے۔ ''قیصر سرمست'' یا ''صلاح الدین'' کے قلمی نام سے نہ صرف شاعری کی بلکہ سینکڑوں مضامین لکھ چکے ہیں۔ ان کے مضامین کئی مشہور و معروف رسالوں میں چھپ چکے ہیں جیسے نگار (ہندوستان)، نگار (پاکستان)، آجکل، نیا دور، شہزادہ، پاسبان، قومی زبان، بانو، آندھراپردیش، کتاب نما، الحسنات ذکریٰ، سائنس کی دنیا، پیام تعلیم، مسرت، نور کھلونا، غنچہ وغیرہ اس کے علاوہ انہوں نے اپنے والد تمکین سرمست کا دیوان مرتب کرکے ''سرمستی تمکین'' کے نام سے شائع کیا۔ سائنسی موضوعات پر بھی انہوں نے لکھا ہے۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف رہ چکے ہیں جیسے ''سورج سے جراثیم تک''، ''جنگل کا سرمایہ''، ''سائنس پر مبنی چند سوال''، ''چیزیں کیسے بنتی ہیں''، ''یاد ماضی (شخصیات)، ''حیوانات'' اور ''جانورستان'' (بچوں کے لیے)، رینگنے والے جانور اور انسانی جسم کا معجزاتی نظام وغیرہ ان کی تصانیف ہیں۔ ان میں بیشتر کتابوں کا بہار، مغربی بنگال، اترپردیش اور آندھراپردیش اکاڈمیوں کی جانب سے انعامات سے نوازا گیا ہے۔ ایک پی ایچ ڈی کے مقالے ''اردو میں بچوں کا ادب'' اور ''ایک ایم فل کے مقالے ''اردو میں سائنسی ادب'' میں بھی ان کا تفصیلی ذکر کیا گیا ہے۔

اکتوبر ۱۹۶۰ء میں ''ثریا جبین'' سے ان کی شادی ہوئی جن سے ان کے دو لڑکے اور تین لڑکیاں ہیں۔ بڑے لڑکے عمران مصباح الدین (عمران سرمست) کا عین عنفوانِ شباب میں سڑک پر ٹھوکر کھا کر گرنے سے انتقال ہوگیا اور بڑی لڑکی کا بھی سسرال میں انتقال ہوگیا۔ ان کی بیوی ثریا جبین کا بھی انتقال ہو چکا ہے۔ اب دو لڑکیاں اور ایک لڑکا بقید حیات ہے۔ تادم آخر وہ یاقوت پورہ میں مقیم رہے اور ادبی خدمت میں لگے رہے۔ جمعرات ۲۲/ دسمبر ۲۰۱۱ء کو کینسر کے مرض سے ''اسریٰ ہاسپٹل'' حیدرآباد میں انتقال ہوا۔

ولادت

یوسف سرمست ۲۸/ دسمبر ۱۹۳۶ء مطابق ۱۵/ شوال ۱۳۵۵ھ بروز پیر بمقام بشیر باغ حیدرآباد

میں پیدا ہوئے۔ تمکین سرمست اور بدالنساء کی صرف تین اولادیں تھیں جن میں یوسف سرمست کا نمبر دوسرا تھا کیوں کہ یوسف سرمست کا اصل نام یوسف شریف الدین ہے۔ ان کے خاندان میں کوئی بزرگ سرمست کے نام سے تھے، ان ہی کے نام سے انہوں نے قلمی نام سرمست اختیار کیا اور اپنے قلمی نام یوسف سرمست سے خوب شہرت حاصل کی۔ ان کا نام یوسف کیوں رکھا گیا اس کے بارے میں انہوں نے اپنے ایک انٹرویو میں یہ تفصیلات بتائی کہ ان کی بڑی بہن جمیل النساء کی پیدائش کے چھ سات سال بعد تک ان کے والدین کو کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ چنانچہ انہوں نے خدا سے التجائیں کیں۔ اولیاء اللہ کے آستانوں کو واسطہ بنایا۔ حیدرآباد میں حضرت یوسفؒ اور شریف صاحبؒ کا آستانہ بڑا مشہور ہے۔ یہ وہ بزرگ تھے جنہوں نے گولکنڈہ کی فتح میں اورنگ زیب کی مدد کی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت یوسف صاحب اور شریف صاحب دونوں ہی اورنگ زیب کی فوج میں شامل تھے۔ جب ان کی روحانی طاقت کی مدد سے گولکنڈہ فتح ہو گیا تو دونوں نے دنیا سے پردہ کر لیا۔ ان بزرگان دین کا آستانہ جو کہ آج مرجع خلائق بنا ہوا ہے۔ ان بزرگوں کے آستانہ پر مانگنے والوں کی دعائیں پوری ہوتی ہیں۔ ان کی والدہ بدرالنساء نے بھی اسی آستانے کا سہارا ڈھونڈا اور یہ منت مانگی کہ اگر لڑکے کی ولادت ہوگی تو انہیں کے نام پر نام رکھیں گے چنانچہ جب ۱۹۳۶ء میں اللہ نے انہیں اولادِ نرینہ دی تو انہوں نے انہیں دو بزرگوں کے نام پر سید یوسف شریف الدین نام رکھا۔ یوسف سرمست کے مطابق اکثر یوسف اور شریف دو نام علیحدہ علیحدہ استعمال ہوتے ہیں لیکن ان کا یوسف شریف رکھا گیا جو بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔ اس طرح ان کی ولادت بڑے منتوں اور مرادوں سے ہوئی۔ ان کے نام کے ساتھ ''سرمست'' کا استعمال کیوں کیا جاتا ہے پوچھے جانے پر انہوں نے بتایا کہ ''ہمارے کوئی ''جداعلیٰ'' تھے سرمست کے نام سے۔ بابا نے تخلص میں سرمست کا استعمال کیا، وہیں سے یہ سلسلہ چلا آرہا ہے۔'' یہی وجہ ہے کہ ان کے والد کا نام تمکینؔ سرمست تھا اس کے بعد انہوں نے بھی یوسف کے ساتھ سرمست کا اضافہ کر کے اپنا قلمی نام یوسف سرمست اختیار کیا۔ اس کے بعد ان کے بھائی قیصر سرمست اور ان کی اولادوں اور ناتے پوتیوں سبھی کے نام کے ساتھ ''سرمست'' کا استعمال ہوا ہے۔ ان کی اس طرح ان کا اصل نام سید یوسف شریف الدین اور قلمی نام

''یوسف سرمست'' ہے۔

تعلیم

سید یوسف شریف الدین کی ابتدائی تعلیم ان کی والدہ محترمہ کی زیر نگرانی گھر ہی پر ہوئی۔ قرآن شریف اور اردو کا بولتا قاعدہ انہوں نے اپنی والدہ ہی سے پڑھا اور جب انہیں حروف کی شناخت ہوگئی اعداد کی واجبی گنتی آ گئی۔ حروف کو جوڑ کر لفظ بنانا شروع کیا، الفاظ کی قرأت ٹھیک سے کرنے لگے تو پھر انہیں مدرسہ میں شریک کر دیا گیا۔ یوسف سرمست اپنی والدہ محترمہ کے طریقۂ تعلیم اور محبت وشفقت کے برتاؤ کا ذکر کرتے ہوئے انٹرویو میں کہتے ہیں:

> ''میری تعلیم کا آغاز اس وقت ہوا جب دوسری جنگ عظیم کے عذاب میں ساری دنیا شامل تھی۔ یقین سے تو کہہ نہیں سکتا کہ میری عمر اس وقت کیا تھی۔ میری تاریخ پیدائش ۲۸/ دسمبر ۱۹۳۶ء ہے اس لیے اندازاً پانچ چھ سال کی عمر میں تعلیم شروع ہوئی ہوگی۔ میری والدہ بچوں کی تعلیم سے بے حد فکر مند رہا کرتی تھیں۔ وہ خود پڑھی لکھی تھیں۔ اس لیے ابتداء میں والدہ نے مجھے پڑھایا۔ اردو کا وہ قاعدہ جو سب سے پہلے پڑھا تھا۔ اس کا سرورق آج تک ذہن میں محفوظ ہے۔ اس پر اعلیٰ حضرت حضور نظام حیدرآباد کی تصویر چھپی ہوئی تھی۔ والدہ محترمہ نے تعلیم کا آغاز جس محبت اور شفقت سے کیا تھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تعلیم کی ساری منزلیں میرے لیے سہل ہوگئیں۔ تعلیم سے شغف پیدا ہوا جو آج ذریعہ روزگار اور وسیلہ زندگی بھی ہے۔''[1]

---

[1] شخصی انٹرویو، پروفیسر یوسف سرمست، کنعان۔II، جوبلی ہلز، جرنلسٹ کالونی، ۲۲ فروری ۲۰۱۷ء

تمکین سرمست نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ بشیر پیالس، بشیر باغ میں گزارا۔ یوسف سرمست کی پیدائش بھی یہیں ہوئی لیکن ۴۲۔۱۹۴۱ء میں وہ اپنی موروثی حویلی واقع مغل پورہ چلے آئے تھے مغل پورہ کے پاس ہی ہری باؤلی محلے میں ''رفاہ عام مڈل اسکول'' موجود تھا۔ یوسف سرمست کو اسی اسکول میں ابتداء میں شریک کروایا گیا۔

یوسف شریف الدین نے ''رفاہ عام مڈل اسکول'' سے پانچویں کا امتحان پاس کیا۔ چھٹی اور ساتویں جماعت کی تعلیم شاہ علی بنڈہ مڈل اسکول سے حاصل کی اور جی جان سے محنت کرکے ساتویں کا بورڈ امتحان اچھے نمبرات سے کامیاب کیا۔ شاہ علی بنڈہ مڈل اسکول کے طریقہ تعلیم اور اساتذہ کی شفقتوں کو وہ آج بھی یاد کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اساتذہ سرکاری مدرسے سے وابستہ ہونے کے باوجود بڑے شوق اور انہماک سے پڑھایا کرتے تھے وہ صرف تعلیم ہی نہیں دیتے تھے عملی تربیت بھی اپنے طالب علموں کی کیا کرتے تھے۔

ساتویں جماعت میں کامیابی کے بعد انہیں کسی ہائی اسکول میں داخلہ لینا تھا۔ واقف کار لوگوں نے مختلف سرکاری و غیر سرکاری اسکولوں کے ساتھ مشنری اسکول کے نام تجویز کئے۔ کسی نے مشورہ دیا ''سٹی کالج میں داخلہ دلایا جائے''۔ اس زمانے میں سٹی کالج میں ڈگری و انٹرمیڈیٹ کے ساتھ ساتھ ہائی اسکول کی تعلیم کا بھی نظام تھا۔ یوسف سرمست کو یہ مشورہ پسند آیا۔ اس لیے سٹی کالج عثمانیہ یونیورسٹی سے منسلک ہونے کی بنا پر اپنی اعلیٰ تعلیمی انفرادیت رکھتا تھا۔ انہوں نے اپنی اس خواہش کا اظہار اپنے والد سے کیا۔ چنانچہ تمکین سرمست نے خود سٹی کالج میں یوسف سرمست کا داخلہ آٹھویں جماعت میں کروادیا۔

یوسف شریف الدین نے سٹی ہائی اسکول، سٹی کالج سے میٹرک کا امتحان کامیاب کیا۔ تقریری و تحریری مقابلوں میں حصہ لینے کے علاوہ کھیل کود میں بھی حصہ لیا کرتے تھے۔ میٹرک تک انہوں نے تعلیم اردو ذریعہ سے حاصل کی لیکن انٹرمیڈیٹ کی تعلیم کے لیے بدلتے سیاسی و تعلیمی حالات کی بناء پر اردو ذریعہ تعلیم ممکن نہ تھا چنانچہ انہوں نے انگریزی میڈیم سے انٹرمیڈیٹ کرنے کا ارادہ کیا۔ یوسف شریف الدین کا ارادہ تھا کہ وہ میڈیسن کی تعلیم حاصل کریں۔ اسی مناسبت سے انہوں نے سیف آباد سائنس

کالج میں ایف اے سائنس میں داخلہ لیا لیکن کچھ ہی عرصہ بعد ان کی طبیعت خراب رہنے لگی اور پھر تعلیم جاری رکھنا مشکل ہو گیا اس طرح ان کا ایک برس ضائع ہو گیا۔

یوسف سرمست کی طبیعت جب کچھ سنبھلی تو انہوں نے آرٹس کے مضامین کے ذریعہ انٹرمیڈیٹ کی تکمیل کر لی۔ اسی طرح گریجویشن کی تکمیل بھی آرٹس ہی کے مضامین سے ہوئی۔ آرٹس کالج جامعہ عثمانیہ میں داخلہ لیا۔ بی اے کے لیے مضامین اردو، معاشیات اور سماجیات منتخب کئے۔ ۱۹۵۶ء میں درجہ دوم میں گریجویشن کامیاب کیا۔ بی اے میں پروفیسر عبدالقادر سروری، جناب سید محمد، ڈاکٹر حفیظ قتیل اور ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ جیسے اساتذہ سے تعلیم حاصل کی تھی۔

گریجویشن کی تعلیم کے دوران بھی یوسف سرمست سخت بیمار ہوئے اور پھر ان کا ایک اور برس ضائع ہوا۔ لیکن ان نامساعد حالات کے باوجود انہوں نے ہمت و حوصلہ نہیں ہارا اور تعلیم حاصل کرنے کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے۔ بی اے کی تکمیل کے بعد انہوں نے ۱۹۵۸ء میں اردو میں ایم اے میں داخلہ حاصل کیا۔ یوسف سرمست کے مطابق ان کے ساتھ صرف دو اور طالب علم موجود تھے۔ ایک لڑکی ''متینہ'' اور ایک لڑکا ''صفی اللہ''۔ اس طرح کل تین طلباء تھے۔ ایم اے میں پڑھانے والے اساتذہ وہی تھے جنہوں نے بی اے میں انہیں پڑھایا تھا لیکن اب طریقہ تعلیم بدل چکا تھا۔ ایم اے کی تعلیم اور اساتذہ کے طریقۂ تدریس کے تعلق سے یوسف سرمست ایک انٹرویو میں کہتے ہیں:

> ''پروفیسر عبدالقادر سروری عام طور پر لسانیات اور تاریخ زبان پڑھایا کرتے تھے۔ وہ اس کے مطابق لکچر بھی دیتے تھے اور بورڈ پر مختلف نقشے بنا کر علم زبان کو سمجھاتے تھے لیکن کبھی اپنی مصروفیات ہوتی تو وہ پڑھایا نہیں کرتے بلکہ طلباء کو ہدایت کرتے تھے کہ آپ لائبریری جائیں اور وہاں کسی کتاب کا نام بتا کر اس کا مطالعہ کریں۔ اکثر طلباء اس ہدایت پر کاربند رہتے تھے اور متعلقہ کتاب سے مواد اخذ کر لیتے تھے۔ اسی طرح ایک دفعہ انہوں نے مجھ سے کہا

کہ آپ گیریرنس کی Ligaistic Sunsey of India کی جلد نہم کا
وہ حصہ پڑھیں جس میں گیریرنس نے اردو کے ارتقاء سے بحث کی
ہے۔ اس طرح سے طلباء بڑے خلوص اور محنت کے ساتھ اپنی علمی
استعداد بڑھاتے تھے۔''[ا]

اس طرح انہوں نے ایم اے کی تعلیم کے دوران اساتذہ کی طریقہ تدریس کا جو طریقہ بیان کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت کے اساتذہ صرف نوٹس دینے کے عادی نہیں تھے بلکہ اپنے طالب علموں کو حقیقی معنوں میں ادب کا ماسٹر بنانا چاہتے تھے۔ انہیں مطالعہ کی جانب راغب کرتے تھے انہیں ادب کو از خود سوچنے، سمجھنے اور غور وفکر کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دیتے تھے۔ جس زمانے میں یوسف سرمست آرٹس کالج کے شعبہ اردو سے ایم اے کر رہے تھے اس وقت آرٹس کالج کے مختلف جماعتوں میں جو طلباء اور طالبات تعلیم حاصل کر رہے تھے ان میں راہی قریشی، ثمینہ شوکت، سعادت نظیر، رشید موسوی، ناصر کرنولی، محمد عبدالرزاق فاروقی، آمینہ انصاری، حبیب ضیاء، صفی الدین، حمیرہ جلیلی، قدیر انصاری، شاذ تمکنت ایسے طالب علم تھے جنہوں نے اپنی تعلیم کے بعد درس وتدریس کے برتر پیشے کو اختیار کیا اور ادب کی دنیا میں نمایاں خدمات انجام دیں۔

یوسف سرمست نے ۱۹۶۰ء میں ایم اے (اردو) درجہ اول میں کامیاب کیا اور پی ایچ ڈی میں داخلہ حاصل کرنے کے لیے درخواست دی۔ اس زمانے میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لیے داخلہ بڑے سخت مرحلوں کے بعد ملتا تھا۔ انہیں بھی ان سخت مرحلوں سے گزرنا پڑا۔ بالآخر ان کی انتھک کوششیں کامیاب ہوئیں اور انہیں پی ایچ ڈی میں داخلہ مل گیا۔ پروفیسر عبدالقادر سروری ان کے نگران مقرر ہوئے اور ان کے مقالے کا تحقیقی موضوع بعنوان ''بیسویں صدی میں اردو ناول'' مقرر ہوا۔ انہیں داخلہ حاصل کئے ابھی دو برس ہوئے تھے کہ ان کے نگران پروفیسر عبدالقادر سروری کا تقرر کشمیر یونیورسٹی سرینگر میں عمل میں آیا۔ جب وہ جامعہ عثمانیہ سے استعفیٰ دے کر کشمیر چلے گئے تو ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کو یوسف شریف الدین

ا شخصی انٹرویو، پروفیسر یوسف سرمست، کنعان۔II، جرنلسٹ کالونی، حیدرآباد، ۲۲ فروری ۲۰۱۷ء

کے مقالے کا نگران مقرر کیا گیا۔ ایم اے کی کامیابی کے بعد ہی یوسف سرمست مختلف کالجوں میں درس و تدریس کے فرائض انجام دے رہے تھے کہ ۱۹۶۳ء میں ان کا تقرر بحیثیت لکچرر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ میں ہوا اور انہیں سائنس اور آرٹس کالج ورنگل سے رجوع ہونے کا حکم دیا گیا۔ مستقل تقرر کی وجہ سے انہیں دل جمعی سے ریسرچ کرنے میں مشکل پیش آ رہی تھی ساتھ ہی ملازمت کی مصروفیت اور گھر سے دور ہونے کی بناء پر وہ چاہتے ہوئے بھی اپنے مقالے کی تکمیل کے لیے وقت نہیں نکال پائے۔ چنانچہ پانچ برس کی مدت میں وہ مقالہ داخل نہیں کر سکے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پروفیسر کی حیثیت سے ڈاکٹر مسعود حسین خان کا تقرر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ میں عمل میں آیا تھا۔ بنیادی طور پر وہ محقق تھے اور تحقیق میں لاپرواہی یا تن آسانی کو وہ اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ چنانچہ جب انہیں اس بات کا علم ہوا کہ یوسف سرمست اپنے مقالے کی تکمیل میں سنجیدہ نہیں ہیں اور ان کی دلچسپی دوسری طرف زیادہ ہے تو انہوں نے داخلہ ختم کرنے کا حکم صادر کیا۔ ایسے آڑے وقت میں یوسف سرمست کی نگران ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کرتے ہوئے اپنے ریسرچ اسکالر کے ساتھ ہمدردی کی اور جامعہ عثمانیہ کے رجسٹرار سے مل کر یوسف سرمست کو مقالہ داخل کرنے کے لیے ایک معقول مدت کی مہلت دلائی۔

یوسف سرمست کی عین خواہش تھی کہ ڈاکٹریٹ کی تکمیل کر لی جائے چنانچہ انہوں نے اس موقع کو غنیمت جانا اور ملازمت سے بلا معاوضہ انہوں نے دو ماہ کی رخصت حاصل کر لی اور رات دن ایک کرتے ہوئے ۱۹۶۶ء میں اپنا ضخیم مقالہ داخل کر دیا۔ ۱۹۶۸ء میں انہیں اس مقالے پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا کی گئی۔ انہوں نے یہ ڈگری آٹھ سال میں مکمل کی۔ پروفیسر آل احمد سرور اور خواجہ احمد فاروقی ان کے ممتحن تھے جنہوں نے ڈگری دیئے جانے کے حق میں رپورٹ روانہ کی تھی۔ اس طرح ۱۹۶۸ء میں انہیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا کی گئی۔

شادی اور ازدواجی زندگی

۱۹۶۷ء میں یوسف سرمست کا تبادلہ جامعہ عثمانیہ میں بحیثیت لکچرر ہوا۔ ۱۱ اگست ۱۹۶۷ء کو انہوں

نے جناب وحید احمد فاروقی انجینئر کی صاحبزادی شہناز وحید کے ساتھ نکاح کیا۔شہناز وحید نے بی ایس سی کرنے کے بعد بی ایڈ کیا تھا۔ یوسف سرمست سے شادی انجام پانے کے بعد انہوں نے اپنے شوہر کی اردوادب سے وابستگی کا لحاظ وخیال کرتے ہوئے ادارہ ادبیات اردو سے اردو فاضل کامیاب کیا اور بعد ازاں اردو سے ایم اے کیا۔ شادی کے بعد یوسف سرمست کی اہلیہ شہناز وحید نے شوہر کے نام کی مناسبت سے اپنا نام شہناز یوسف رکھ لیا۔ اردو سے ایم اے کرنے کے بعد،شوہر کی مرضی اور عزیز و اقارب کے مشورہ سے پیشہ تدریس سے وابستہ ہوئیں اور حیدرآباد پبلک اسکول میں بحیثیت اردو ٹیچر خدمات انجام دیں اور یہیں سے ۲۰۰۳ء میں پیشہ درس وتدریس سے سبکدوش ہوئیں۔

پروفیسر یوسف سرمست کے تین لڑکے سید جنید عرفان سرمست،سید رضوان یوسف سرمست،اور سید سلمان یوسف سرمست ہیں۔انہوں نے اپنے تینوں بیٹوں کو عصر حاضر کی مروجہ اعلیٰ تعلیم سے آراستہ کیا۔تینوں ہی لڑکوں نے کمپیوٹر کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ ہندوستان کے علاوہ بیرون ہند جیسے سعودی عرب، امریکہ،فرانس میں بھی ملازمت کی۔تینوں ہی بچوں کی شادیوں کے فرائض سے وہ سبکدوش ہو چکے ہیں۔ بڑی بہو آسیہ جنید،دوسری اسریٰ فاطمہ سارہ اور تیسری عالیہ سلمان سرمست ہیں۔ان کی تینوں بہویں اعلیٰ تعلیم یافتہ اور فرمانبردار ہیں۔اللہ تعالیٰ نے انہیں پوتے پوتیوں کی دولت سے بھی مالا مال کیا ہے۔ پوتے پوتیوں میں زارہ جنید سرمست، سید طٰہٰ جنید سرمست، ایمن جنید سرمست، نشاء رضوان سرمست، نائلہ رضوان سرمست اور انا سلمان سرمست ہیں جو ابھی کم عمر ہیں اور حصول تعلیم میں مصروف ہیں۔

یوسف سرمست کی گھریلو زندگی بڑی پرسکون ہے۔دونوں میاں بیوی میں بڑا اتفاق اور ہم خیالی ہے۔شادی کے بعد انہوں نے ۱۹۸۰ء میں بنجارہ ہلز روڈ نمبر۱۲ پر دوسو گز زمین کا ایک پلاٹ ۲۵۰ روپئے گز کے حساب سے تقریباً ۵۵ ہزار روپیوں میں انوار العلوم کالج کی لکچرر محترمہ آمنہ انصاری سے خریدا جو اس وقت بہت بڑی رقم تھی اور ۱۹۸۵ء میں ایک خوبصورت مکان تعمیر کیا جس کا نام انہوں نے ''کنعان'' رکھا۔کافی عرصہ بعد اس مکان کو کرایہ پر دیا۔(کیوں کہ زیادہ کرایہ آرہا تھا)اور خود بنجارہ ہلز روڈ نمبر۱۳ پر ایک کرایہ کے مکان میں منتقل ہو گئے۔ پھر ۲۰۰۳ء میں جوبلی ہلز، جرنلسٹ کالونی میں مشہور جرنلسٹ

A.B.K.Prasad کا تیار شدہ مکان جو ساڑھے تین سو گز زمین پر پھیلا ہوا ہے خریدا اور دو سال بعد یعنی تقریباً ۲۰۰۵ء کو اس نئے مکان میں منتقل ہو گئے اور اب اپنے افراد خاندان کے ساتھ اسی مکان میں رہائش پذیر ہیں اور اس کا نام کنعان۔II رکھا ہے۔

ملازمت

یوسف سرمست نے ۱۹۶۰ء میں جب پی ایچ ڈی میں داخلہ لیا ان کے نگران پروفیسر عبدالقادر سروری نے ان کا عارضی تقرر دو ماہ کے لیے نظام کالج میں بحیثیت جز وقتی لکچرر کیا۔ بعدازاں انہوں نے حیدرآباد ایوننگ کالج اور وی سی کالج میں جز وقتی لکچرر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ ۱۹۶۳ء تک یوسف سرمست اسی طرح حیدرآباد کے مختلف کالجوں میں عارضی طور پر خدمات انجام دیتے رہے۔ بعدازاں جولائی ۱۹۶۳ء میں ان کا تقرر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ میں ہوا اور ۱۹۶۵ء میں جامعہ عثمانیہ میں یوسف سرمست کا باضابطہ تقرر ہوا۔ یہاں انہوں نے دو سال خدمات انجام دیں۔ ۱۹۶۷ء میں یوسف سرمست کا تبادلہ حیدرآباد ہوا۔ یہاں انہوں نے سیف آباد، سائنس کالج اور بعدازاں نظام کالج، حیدرآباد ایوننگ کالج اور پھر سکندرآباد ایوننگ کالج میں خدمات انجام دیتے رہے۔ پانچ سال جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد کے مختلف کالجوں میں خدمات انجام دینے کے بعد ڈاکٹر یوسف سرمست کا دوبارہ تبادلہ ۱۹۷۲ء میں ورنگل ہو گیا۔ یہاں مزید دو برس انہوں نے خدمات انجام دیں۔ ڈاکٹر یوسف سرمست گزشتہ نو سال سے بحیثیت لکچرر خدمات انجام دے رہے تھے۔ جب ۱۹۷۴ء میں ان کا تبادلہ پھر حیدرآباد ہوا تو انہیں اس مرتبہ پہلی بار پوسٹ گریجویشن کی تدریسی خدمات عطا کی گئیں۔ اگست ۱۹۷۵ء میں انہیں ریڈرشپ کا عہدہ دیا گیا۔ ۱۹۷۶ء میں ریسرچ گائیڈ قرار دیا گیا۔ ۱۹۷۸ء میں انہیں شعبہ اردو آرٹس کالج جامعہ عثمانیہ میں خدمات انجام دینے کے لیے کہا گیا۔ ۱۹۸۴ء میں انہیں پروفیسر کے عہدہ پر منتخب کیا گیا۔ مئی ۱۹۸۶ء میں وہ صدر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ مقرر ہوئے۔ ۱۹۸۸ء تک بحسن خوبی یہ خدمات انجام دیں۔ ۱۹۹۲ء میں انہیں دوسری مرتبہ صدر شعبہ اردو مقرر کیا گیا۔ ۱۹۹۴ء میں وہ اس فریضے سے سبکدوش

ہوئے۔

تقریباً ۳۰ برس تک جامعہ عثمانیہ میں تدریسی خدمات انجام دینے کے بعد ۳۱/ دسمبر ۱۹۹۶ء میں وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے۔ جامعہ عثمانیہ کے ارباب مجاز نے پروفیسر یوسف سرمست کی خدمات سے ان کی سبکدوشی کے بعد بھی تقریباً چھ برس تک خدمات حاصل کیں۔ دورانِ ملازمت ان کے چند ساتھی اساتذہ تھے مسعود حسین خان، عبدالقادر سروری، ڈاکٹر حفیظ قتیل، پروفیسر رفیعہ سلطانہ، ڈاکٹر ثمینہ شوکت، ڈاکٹر ابوالفضل محمود قادری، سیدہ جعفر، ڈاکٹر رشید الحسن، ڈاکٹر مغنی تبسم، اختر شاہ خان (ورنگل)، ڈاکٹر حبیب ضیاء، ڈاکٹر اشرف رفیع، عقیل ہاشمی، محمد علی اثر، عثمان علی، تاتار خان، زینت ساجدہ، بیگ احساس وغیرہ۔ ان میں سے کچھ تو ان کے شاگرد بھی تھے جیسے ڈاکٹر عقیل ہاشمی، ڈاکٹر بیگ احساس وغیرہ اور کچھ تو ان کے اساتذہ بھی تھے اور ساتھ میں مل کر شعبہ میں کام بھی کیے تھے۔

یوسف سرمست اپنی صلاحیتوں اور اعلیٰ علمی و ادبی ذوق سے ہمیشہ اپنے طالب علموں اور ساتھیوں کو متاثر کرتے رہے۔ صدر شعبہ اردو کے معیار اور وقار میں اضافہ کیا۔ طالب علموں کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے لیے شعبہ کے تحت کئی ادبی سرگرمیاں منعقد کیں جیسے توسیعی لکچرس، سمینارس، کانفرنس اور بین جامعاتی ادبی مقابلے وغیرہ۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ ''آل انڈیا اردو ریسرچ اسکالرس کونسل'' کا قیام تھا چونکہ وہ خود زمانہ طالب علمی سے وسیع تر مطالعہ اور تحقیق و تنقید کو اہمیت دیتے تھے۔ لیکن بہ حیثیت استاد کے جب اپنے طالب علموں میں ان صلاحیتوں کی کمی کو محسوس کیا تو طلباء کی رہنمائی کے لیے یہ بہتر طریقہ کار اپنایا جس کے تعلق سے یوسف سرمست خود اپنے ایک انٹرویو میں کہتے ہیں:

> ''نوجوان طالب علم جو آگے کے ادیب یا شاعر بننے والے ہیں ان کی تربیت ہو، مطالعہ کا شوق پیدا ہو، ریسرچ اسکالرس میں لکھنے پڑھنے کی عادت ہو، ریسرچ میں مختلف جگہوں سے استفادہ کرکے مضمون تیار کرنے کی صلاحیت پیدا ہو، اس مقصد کے تحت میں ایم۔اے کے طالب علموں کو عنوانات دیتا تھا۔ سمینار رکھتا تھا جس

میں ایم۔اے کے طالب علموں کے ساتھ ساتھ ریسرچ اسکالرس
بھی شریک ہوتے تھے۔''[1]

غرض اس طرح ڈاکٹر یوسف سرمست کی سرپرستی میں اردو ریسرچ اسکالرس کئی مہینوں سے تحقیقی موضوعات پر ماہانہ سمینارس منعقد کررہے تھے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ مختلف جامعات سے تعلق رکھنے والے اسکالرس کے لیے ایسے پلیٹ فارم کی ضرورت ہے جہاں انہیں ایک دوسرے کے خیالات و تجربات سے آگاہی ہو اور استفادہ کرنے کی سہولیت میسر ہو۔ لہٰذا ڈاکٹر یوسف سرمست کی سرپرستی میں اردو ریسرچ اسکالرس کی ایک تنظیم ''آل انڈیا اردو ریسرچ اسکالرس'' کے نام سے قائم کی گئی تا کہ مختلف جامعات سے تعلق رکھنے والے اسکالرس کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا جائے۔ نیز ملکی سطح پر مختلف جامعات میں اردو تحقیق کا جائزہ لینے کے علاوہ نئے اسکالرس میں ان کی صلاحیتوں کو ابھارنے کے ساتھ ساتھ اردو زبان وادب کی ترقی وترویج کے لیے کام کیا گیا۔ اس کے تحت سمینارس ڈاکٹر یوسف سرمست کے مکان ''کنعان'' روڈ نمبر ۱۲ بنجارہ ہلز پر ہر اتوار کو صبح ۹:۳۰ بجے منعقد کئے جاتے تھے۔ ان میں سے چند موضوعات حسب ذیل ہیں:

۱۔ تخلیق اور تنقید کا رشتہ
۲۔ تحقیق میں مواد کی فراہمی کے ذرائع
۳۔ ترسیلی لسانیات
۴۔ حیدرآباد کی جامعات میں اردو تحقیق
۵۔ حیدرآباد میں اردو نثر کا ارتقاء
۶۔ اردو نثر کی مختلف اصناف کی ترقی میں حیدرآباد کا حصہ
۷۔ اردو نثر اور علی گڑھ تحریک
۸۔ اسماء پر مبنی ضائع وبدائع

---

[1] شخصی انٹرویو، پروفیسر یوسف سرمست، رہائش گاہ کنعان۔II، جوبلی ہلز، جرنلسٹ کالونی، حیدرآباد، ۲ مارچ ۲۰۱۷ء

۹۔ اعلیٰ تعلیم اور روزگار وغیرہ وغیرہ

یہاں پر صرف طالب علموں اور ریسرچ اسکالرس کے علاوہ حیدرآباد و بیرون حیدرآباد کے ممتاز ادیب و دانشور اور اساتذہ بھی بحیثیت مہمان خصوصی تشریف لاتے تھے اور اپنے گرانقدر مشوروں سے نوازا کرتے تھے۔ جیسے پروفیسر شہریار (علی گڑھ)، پروفیسر ثمینہ شوکت (صدر شعبہ اردو حیدرآباد یونیورسٹی)، سکندر توفیق، ڈاکٹر طیب انصاری (ریڈر، گلبرگہ یونیورسٹی)، ڈاکٹر محمد علی اثر، احمد سلطان، ڈاکٹر یوسف اعظمی، محمد منظور احمد، ڈاکٹر رحمت یوسف زئی (سابق صدر شعبہ اردو سنٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد) اہم ہیں۔ اس طرح یہ سلسلہ جو تقریباً ۱۹۸۵ء سے شروع ہوا۔ ڈاکٹر یوسف سرمست کے بنجارہ سے جوبلی ہلز کے مکان منتقل ہونے کے بعد منقطع ہو گیا۔ یعنی ۱۹۸۵ء سے ۲۰۰۴ء تک ہی یہ سلسلہ چلتا رہا۔ اس کے منقطع ہونے کے وجوہات کچھ بھی ہوں لیکن اس سے بے شمار طالب علموں کو بے پناہ فائدہ پہنچا جس کی وجہ سے انہوں نے ادبی دنیا میں اپنی شناخت بنائی اور ادب کے دامن کو وسیع کیا اور آج بھی لکھنے پڑھنے میں مشغول رہتے ہیں۔[۱]

ادبی سفر

یوسف سرمست نے ایم اے کی تعلیم کے دوران مضامین لکھنے شروع کئے۔ انہوں نے اپنی زندگی کا پہلا ادبی مضمون ''میر کی شاعری اور شخصیت'' لکھا جو رسالہ ''نگار'' میں شائع ہوا۔ انہوں نے دوسرا مضمون ''مصحفی کی شاعری'' کے عنوان سے لکھا جو ۱۹۶۰ء میں رسالہ ''نگار'' میں شائع ہوا۔ اس طرح وہ یوسف شریف الدین سے یوسف سرمست بن گئے۔ ان کے مضامین رسالہ ''صبا'' اور ''نوائے ادب'' میں شائع ہوا کرتے تھے۔ ادبی ذوق، تحقیق کا جذبہ اور تحریری صلاحیتیں ان میں ابتدا ہی سے تھی۔ انہیں ادب سے خاص دلچسپی تھی اور ادب سے دلچسپی تو ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ گھر کا ماحول ادبی تھا۔ گھر پر کئی رسالے آتے تھے جن کا مطالعہ وہ کرتے تھے۔ جیسے ''ارباب'' بچوں کے رسالے ''پھول'' (دلی) اور ''غنچہ''

---

[۱] شخصی انٹرویو، پروفیسر یوسف سرمست، رہائش گاہ کنعان۔II، جرنلسٹ کالونی، جوبلی ہلز، حیدرآباد، ۲/ مارچ ۲۰۱۷ء

(دلی) وغیرہ۔ ان کی بہن بچپن میں انہیں ناول پڑھ کر سناتیں تھیں۔ مڈل اسکول ہی میں انہوں نے ''الف لیلیٰ'' کا مطالعہ کرلیا تھا۔ سٹی کالج لائبریری سے ساحر لدھیانوی کا پہلا مجموعہ ''تلخیاں'' پڑھ کر وہ لطف اندوز ہوتے تھے۔ انہوں نے آٹھویں جماعت میں ایک مضمون لکھا تھا جسے پڑھ کر استاد نے خوشی کا اظہار کیا تھا۔ یوسف سرمست اس مضمون کے تعلق سے اپنے انٹرویو میں فرماتے ہیں:

> نیاز فتح پوری رسالہ ''نگار'' پاکستان نمبر نکالتے تھے۔ اس وقت اس میں ہندوستان کے ابتدائی مسلم حکمرانوں کی تفصیل آرہی تھی۔ اتفاق سے ہمارے استاد ''سید علی برترؔ'' نے خاندان غلامان کے تعلق سے کوئی عنوان دیا تھا جس پر مضمون تیار کرنا تھا۔ میں نے ''نگار'' کے شمارے سے استفادہ کرکے پرچہ تیار کیا اور داخل کردیا جسے پڑھ کر استاد متعجب ہوئے کیوں کہ اس میں ایسی ایسی معلومات تھیں جو خود استاد کے بھی علم میں نہیں تھیں چنانچہ انہوں نے مجھ سے اس کی تفصیل جانی کہ مواد کہاں سے ملا وغیرہ اور تفصیل جان کر بہت خوش ہوئے۔ بہت تعریف کی۔ اچھے نمبرات دیئے۔''[1]

اس مضمون کے علاوہ وہ سٹی کالج کا ایک میگزین نکلتا تھا ''الموسیٰ'' کے نام سے۔ آٹھویں جماعت میں انہوں نے اس میں ایک مضمون ''بوعلی سینا'' پر لکھا تھا۔ اس کے علاوہ حیدرآباد کے بچوں کے لیے ایک رسالہ ''تارے'' کے عنوان سے نکلتا تھا۔ جس کے ایڈیٹر مسلم ضیائی تھے۔ انہوں نے بعض لطیفے لکھے تھے جو اس میں شائع ہوچکے ہیں۔ جب کہ وہ ابھی مڈل بھی پاس نہیں ہوئے تھے۔ ایم اے کے امتحان کی تیاری وہ بالکل مختلف طریقے سے کرتے تھے۔ شعرا کے تعلق سے مختلف کتابیں پڑھ کر وہ خود ہی مضمون تیار کرلیتے تھے۔ اس طرح ایم اے کے زمانے میں میر تقی میرؔ پر ایک مضمون انہوں نے تیار کیا تھا۔ ''میرؔ کی شاعری اور شخصیت'' کے عنوان سے تھا۔ اس مضمون کو چپکے سے انہوں نے جو کسی کو بتائے بغیر ایک اعلیٰ

---

[1] شخصی انٹرویو، پروفیسر یوسف سرمست، کنعان۔II، جرنلسٹ کالونی، جوبلی ہلز، حیدرآباد، ۵/ مارچ ۲۰۱۷ء

درجہ کے عنوان سے تھا ادبی رسالہ ''نگار'' (لکھنو) کو شائع کرنے کے لیے بھیج دیا اور ایڈیٹر علامہ نیاز فتح پوری جو خود کئی کتابوں کے مصنف تھے کے نام ایک خط لکھا کہ

''میں نہیں جانتا کہ یہ مضمون کیا ہے۔ کیسا لکھا ہے۔ اس سلسلے میں آپ کی رہبری چاہتا ہوں۔''

جواب میں علامہ نے مضمون پر کوئی تبصرہ نہیں کیا صرف اتنا لکھا کہ آپ کا مضمون آئندہ اپریل کو نگار (لکھنو) میں شائع ہورہا ہے۔ میرؔ پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے۔ آپ ایسے شاعر کو لیجئے جو باوجود جلیل القدر ہونے کے گمنامی میں پڑا ہوا ہے۔ اس مضمون کے بارے میں انہوں نے اپنے انٹرویو میں تفصیلات بتاتے ہوئے کہا کہ:

''میں نے مصحفیؔ پر مضمون تیار کرلیا اور وہ بھی ''نگار'' (لکھنو) کو روانہ کردیا۔ اتفاق سے اس مضمون پر اپنا نام لکھنا بھول گیا۔ اس زمانے میں ایڈیٹر کے نام خط الگ لکھا جاتا تھا اور مضمون الگ۔ اب مضمون پر تو نام نہیں ہے۔ چنانچہ ایڈیٹر نے ایک نام ''ایک پروفیسر'' لکھا (چونکہ پروفیسر بھولنے کے لیے شہرت رکھتے ہیں شاید اسی مناسبت سے ایڈیٹر نے پروفیسر لکھ دیا) لیکن میں بڑا خوش ہوگیا کہ طالب علمی کے زمانے میں ہی گویا علامہ کے قلم سے پروفیسر لکھ دیا گیا بلکہ بنادیا گیا۔''[1]

اس اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اوائل عمری ہی سے تحقیقی وتنقیدی مضامین لکھا کرتے تھے اور انہیں بڑے بڑے اساتذہ سے داد بھی ملتی۔ غرض اس طرح ایم اے کے امتحان کی تیاری کے سلسلے میں انہوں نے جتنے مضامین تیار کئے ان میں سے بیشتر مضامین کو بعد میں یکجا کرکے ''عرفانِ نظر'' کے نام سے کتابی شکل دے دی۔

---

[1] شخصی انٹرویو، پروفیسر یوسف سرمست، کنعان۔II، جرنلسٹ کالونی، جوبلی ہلز، حیدرآباد، ۵/ مارچ ۲۰۱۷ء

ایک ہونہار لائق و فائق طالب علم ہونے کے ساتھ ساتھ ادب سے غیر معمولی شغف کی وجہ سے وہ اپنے اساتذہ سے بے حد قریب تھے۔ اساتذہ کی ہمت افزائی نے تحریری صلاحیتوں کو جلا بخشی۔ ایک مضمون کے تعلق سے حفیظ قتیل نے ان کی ستائش کرتے ہوئے انہیں کہا تھا:

''لوگ سر پٹکتے ہیں لیکن لکھنا نہیں آتا۔ تمہاری تحریر میں بہت گہرائی ہے۔ بہت اچھا مضمون لکھا۔''[1]

پروفیسر عبدالقادر سروری انہیں پسند کرتے تھے اور ان کی ادبی صلاحیتوں سے متاثر تھے۔ چنانچہ ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

''سروری صاحب مجھ سے ادبی کام لیا کرتے تھے۔ میرے گھر آتے اور مجھے اپنی کار میں بٹھا کر جہاں جانا ہوتا لے جاتے۔ خاص طور پر لائبریری میں کچھ بھی کام ہوتا جیسے مضامین کی نقل کرنا یا کچھ بھی تو مجھ سے کرواتے۔ اس طرح مجھے بھی مختلف لائبریریوں کو دیکھنے اور مختلف کتابوں کے مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔''[2]

اس طرح اردو ادب سے ان کا شغف بڑھتا گیا اور انہوں نے ایک کے بعد دیگرے کئی کتابیں اور مضامین لکھے۔ ان کی تصانیف کی فہرست ذیل میں درج کی جاتی ہے:

۱۔ پریم چند کی ناول نگاری، دسمبر ۱۹۷۶ء

۲۔ عرفان نظر (مضامین کا مجموعہ)، دسمبر ۱۹۷۷ء

۳۔ ادب کی ماہیت، منصب اور تعریف، اگست ۱۹۸۳ء

۴۔ ادب نقد حیات (تحقیقی، تنقیدی مضامین کا مجموعہ)، دسمبر ۱۹۹۳ء

۵۔ بیسویں صدی میں اردو ناول، مارچ ۱۹۹۵ء

---

[1] روزنامہ سیاست، ۵/ مارچ ۲۰۰۱ء

[2] شخصی انٹرویو، پروفیسر یوسف سرمست، کنعان۔II، جرنلسٹ کالونی، جوبلی ہلز، حیدرآباد، ۲/ مارچ ۲۰۱۷ء

۶۔ تحقیق وتنقید، مارچ ۱۹۹۹ء باراوّل

۷۔ نظری اور عملی تنقید، دسمبر ۲۰۰۲ء باراوّل

۸۔ دکنی ادب کی مختصر تاریخ، دسمبر ۲۰۰۶ء

۹۔ ادب کا نوبل انعام ادبی یا سیاسی اور دوسرے مضامین، دسمبر ۲۰۱۰ء

۱۰۔ اردو افسانہ نگاری میں کرشن چندر کی انفرادیت، ۲۰۱۲ء

ان تصانیف کے علاوہ تقریباً سو سے زائد تحقیقی وتنقیدی مضامین ہندوستان اور بیرونی ممالک کے مشہور ومعروف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔

سمیناروں میں شرکت

یوسف سرمست تقریباً چوبیس (۲۴) کل ہند کانفرنس وسمینار اور نو (۹) بین الاقوامی سمیناروں میں شرکت کر چکے ہیں اور مختلف موضوعات پر مضامین بھی پیش کر چکے ہیں۔ ان کی فہرست ذیل میں درج ہے:

۱۔ اساتذہ کی کل ہند کانفرنس، کشمیر یونیورسٹی، ۱۹۶۷ء

۲۔ اساتذہ کی کل ہند کانفرنس، لکھنو یونیورسٹی، ۱۹۷۱ء

۳۔ اساتذہ کی کل ہند کانفرنس، مرٹھواڑہ یونیورسٹی، ۱۹۷۳ء

۴۔ غالبؔ پر کل ہند سمینار، حیدرآباد، ۱۹۷۴ء

۵۔ جدید اردو شاعری پر کل ہند سمینار، سروی وینکٹیشورا یونیورسٹی، تروپتی، ۱۹۷۵ء

۶۔ پریم چند پر کل ہند سمینار، مدھیہ پردیش اردو اکاڈمی، بھوپال، ۱۹۷۸ء

۷۔ پریم چند پر کل ہند سمینار، جموں، ۱۹۷۹ء

۸۔ پریم چند پر کل ہند سمینار، عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد، ۱۹۸۰ء

۹۔ پریم چند پر کل ہند سمینار، حیدرآباد یونیورسٹی، حیدرآباد، ۱۹۸۱ء

۱۰۔ اقبال پر کل ہند سمینار، اقبال اکاڈمی، حیدرآباد،۱۹۸۳ء

۱۱۔ اساتذہ کی کل ہند کانفرنس، مدراس یونیورسٹی، اورنگ آباد،۱۹۸۳ء

۱۲۔ اردو میں علامت نگاری پر کل ہند سمینار، سری وینکٹیشورا یونیورسٹی، تروپتی،۱۹۸۴ء

۱۳۔ اردو کا اثر ہندوستانی زبانوں پر، کولن (شملہ کے قریب Linguistice کا ایک ادارہ ہے)،۱۹۸۴ء

۱۴۔ حیدرآباد میں بیرونی شعراء کل ہند سمینار، عثمانیہ یونیورسٹی،۱۹۸۶ء

۱۵۔ نصابی منصوبہ بندی (Curricular Development)، علی گڑھ یونیورسٹی، ۱۹۸۶ء

۱۶۔ دکنی ادب پر کل ہند سمینار، دہلی یونیورسٹی،۱۹۸۷ء

۱۷۔ اردو میں لوک ادب پر کل ہند سمینار، دہلی یونیورسٹی،۱۹۸۸ء

۱۸۔ ہندوستان میں تانیثیت (Feminism) پر کل ہند سمینار، عثمانیہ یونیورسٹی،۱۹۸۹ء

۱۹۔ اردو تدریس و تحقیق پر کل ہند سمینار، مدراس یونیورسٹی،۱۹۹۰ء

۲۰۔ اردو ناول پر کل ہند سمینار، دہلی یونیورسٹی،۱۹۹۰ء

۲۱۔ کرشن چندر اور ہم عصر افسانوی ادب، بمبئی،۱۹۹۰ء

۲۲۔ جدید تنقیدی رجحانات کل ہند سمینار، دہلی اردو اکاڈیمی،۱۹۹۳ء

۲۳۔ دکنی ادب پر کل ہند سمینار، عثمانیہ یونیورسٹی،۱۹۹۵ء

۲۴۔ پریم چند کی عصری معنویت کل ہند سمینار، ڈاکٹر امبیڈکر اوپن یونیورسٹی،۲۰۰۵ء

انہوں نے جن بین الاقوامی سمیناروں میں شرکت کی ہے ان کی فہرست اس طرح ہے

۱۔ مشترکہ تہذیب اردو ادب، کشمیر یونیورسٹی،۱۹۸۴ء

۲۔ اردو رسم الخط، بمبئی، ۱۹۸۶ء

۳۔ اقبالؔ، اقبال اکیڈیمی حیدرآباد، ۱۹۸۶ء

۴۔ مولانا ابوالکلام آزاد، علی گڑھ یونیورسٹی، ۱۹۸۹ء

۵۔ اقبال کانفرونس، کل ہند یونیورسٹی اردو اساتذہ کی انجمن، دہلی، ۱۹۹۲ء

۶۔ مرزا غالبؔ، غالبؔ انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی ۱۹۹۲ء

۷۔ جنوبی ایشیاء میں قومی اور علاقائی ادبی تاریخ، سوشیل سائنس ریسرچ کونسل، نیویارک، ۱۹۹۳ء

۸۔ مرزا غالبؔ، ماریشس، ۱۹۹۴ء

۹۔ احیاء اسلام، ریسرچ فاؤنڈیشن آف اسلامک اسٹڈیز، شکاگو، ۱۹۹۵ء

رکن بورڈ آف اسٹیڈیز

وہ مختلف تعلیمی اداروں میں بورڈ آف اسٹیڈیز کے رکن کی حیثیت سے شرکت کر چکے ہیں۔

۱۔ رکن بورڈ آف اسٹیڈیز، اردو، عربی اور فارسی، سری وینکٹیشورا یونیورسٹی، تروپتی

۲۔ رکن بورڈ آف اسٹیڈیز، اردو، کالی کٹ یونیورسٹی، کیرالا

۳۔ رکن بورڈ آف اسٹیڈیز، ویمنس کالج، انوارالعلوم کالج، نظام کالج

۴۔ رکن نصابی منصوبہ بندی برائے پی جی کورسس، علی گڑھ یونیورسٹی، علی گڑھ

بحیثیت بیرونی ممتحن (External Examiner)

وہ ہندوستان کی مختلف جامعات میں بحیثیت ممتحن شرکت کر چکے ہیں۔ ایم فل اور پی ایچ ڈی ممتحن کی حیثیت سے جن جامعات میں تشریف لے گئے ان کی فہرست یوں درج ہے:

۱۔ کشمیر یونیورسٹی ۲۔ علی گڑھ یونیورسٹی

۳۔ میسور یونیورسٹی ۴۔ بنگلور یونیورسٹی
۵۔ سری وینکٹیشورا یونیورسٹی ۶۔ پنجاب یونیورسٹی
۷۔ جواہرلعل نہرو یونیورسٹی ۸۔ بمبئی یونیورسٹی
۹۔ دہلی یونیورسٹی ۱۰۔ حیدرآباد یونیورسٹی
۱۱۔ مدراس یونیورسٹی ۱۲۔ بہار یونیورسٹی

تحقیق کے نگران

یوسف سرمست نہ صرف ایک اچھے استاد تھے بلکہ اچھے نگران بھی تھے۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں دوران ملازمت یوسف سرمست کی زیر نگرانی جن اسکالروں نے ایم فل کی ڈگری حاصل کی ان کی فہرست اس طرح ہے:

۱۔ انیس النساء، حیدرآباد میں افسانہ نگاری، ۱۹۷۶ء
۲۔ سیف نصیر الدین احمد، فکر تونسوی شخصیت اور طنز نگاری، ۱۹۷۶ء
۳۔ محمد رشید الدین، علامہ حیرت بدایونی حیات اور کلام، ۱۹۷۶ء
۴۔ یوسف النساء، حیدرآباد میں اردو ناول کا ارتقاء، ۱۹۸۰ء
۵۔ غوثیہ بیگم، کرشن چندر کی ناولوں اور افسانوں میں افسانوی اقدار، ۱۹۸۰ء
۶۔ فرحت رخسانہ، شمالی ہند کے شعراء (۱۷۰۰ تا ۱۸۰۰) کا دکنی شعراء پر اثر، ۱۹۸۰ء
۷۔ میر احمد الدین علی خاں، میر عثمان علی خاں کی اردو ادبی خدمات، ۱۹۸۱ء
۸۔ محمد عبدالرشید ارشد، دبستان ولی کی شاعری میں قنوطیت، ۱۹۸۱ء
۹۔ فریدہ بیگم، پروفیسر خواجہ احمد فاروقی شخصیت اور کارنامے، ۱۹۸۱ء
۱۰۔ میمونہ وحید، پطرس بخاری حیات اور کارنامے، ۱۹۸۱ء
۱۱۔ محمد شفاعت علی، ڈاکٹر سید عابد حسین حیات اور کارنامے، ۱۹۸۱ء

۱۲۔ عمادالدین علی خان، اردو زبان وادب کی ترقی میں میر عثمان خان کا حصہ،

۱۳۔ منیرالزماں، قدیر عزیز: حیات اور کارنامے

۱۴۔ سلمان عابد، سوغات کی ببلیو گرافی

۱۵۔ جمیل احمد، اقبال متین: حیات اور کارنامے

۱۶۔ ساجدہ رحمانی، اردو انشائیے ابتدا سے ۱۹۳۶ء تک

۱۷۔ عشرت نواز بیگم، اردو ناولوں میں لکھنوی تہذیب کی پیشکشی

۱۸۔ وسیم النساء بیگم، اردو ناول کے مزاحیہ کردار ۱۹۴۷ء سے پہلے

۱۹۔ عطیہ سلطانہ اردو یونیورسٹی کا تصور اور جامعہ عثمانیہ کا قیام، ۱۹۸۲ء

۲۰۔ یاسمین خان، پریم چند کے ناولوں میں اخلاقی اقدار، ۱۹۸۲ء

۲۱۔ سیدہ عاصمہ، عزیم احمد بحیثیت ناول نگار

۲۲۔ نعیم الدین، عثمانیہ یونیورسٹی کے تحقیقی مقالوں کا تنقیدی جائزہ

۲۳۔ ریحانہ پروین، پریم چند کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ

۲۴۔ تاتار خان، مرزا ادیب بحیثیت ڈرامہ نگار

۲۵۔ فاطمہ بی، ڈاکٹر زور اور ان کے رفقاء

۲۶۔ قطب الدین، اکبرالدین صدیقی حیات اور ادبی خدمات

پروفیسر یوسف سرمست کی نگرانی میں مندرجہ ذیل پی ایچ ڈی کے مقالے مکمل ہوئے:

۱۔ میمونہ بیگم، پروفیسر عبدالقادر سروری حیات اور خدمات

۲۔ عزت النساء اردو سفرنامے

۳۔ میمونہ وحید، پروفیسر ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی حیات اور خدمات

۴۔ یاسمین خانم، جامعہ عثمانیہ کی خدمات زبان وادب

۵۔ عطیہ سلطانہ، دیوان غواصی کی تدوین

۶۔ رفیع رؤف، اردو ادب میں ۱۹ویں صدی کی تہذیب

۷۔ ڈاکٹر سلمان عابد، اردو زبان ادب کی تحقیق وتنقید میں مستشرقین کا حصہ

۸۔ ڈاکٹر عبدالحکیم، تنقید نگاری آزادی کے بعد

۹۔ ڈاکٹر ریحانہ پروین، گھریلو ناولوں کا تنقیدی جائزہ ابتداء تا ۱۹۳۶ء

۱۰۔ محمد شفاعت علی، اردو ناول میں سماجی مسائل، ۱۹۹۸ء

۱۱۔ ریحانہ پروین، اردو ناول اور گھریلو مسائل، ۱۹۹۸ء

۱۲۔ اقبال جہاں، اردو میں خطوط نگاری، ۱۹۹۸ء

۱۳۔ بشیر خان، خلیفہ عبدالحکیم (عبدالحکیم)، ۲۰۰۰ء

اعزازی مدیر

وہ بحیثیت اعزازی مدیر جن رسائل سے جڑے رہے ان میں سہ ماہی ''مبصر''، حیدرآباد، (نظام ٹرسٹ لائبریری)، سالانہ ''مجلّہ تحقیقات اردو''، حیدرآباد (جامعہ عثمانیہ شعبہ اردو)، اور ماہنامہ ''دور کے لوگ''، کنیڈا (ہندوستانی مدیر) وغیرہ اہم ہیں۔

انعامات واعزازات

ان کی تمام شائع شدہ کتابوں پر آندھراپردیش اردو اکیڈیمی، اتر پردیش اردو اکیڈیمی، بہار اردو اکیڈیمی نے انعامات واعزازات سے نوازا ہے۔

فریضہ حج

یوسف سرمست کو نومبر ۲۰۱۰ء مطابق ۱۴۳۱ھ میں اپنی شریک حیات، بڑے بیٹے، بڑی بہو اور تیرہ سالہ پوتی زارہ جنید سرمست کے ساتھ حج بیت اللہ کی سعادت بھی نصیب ہوئی۔

شخصیت

یوسف سرمست کی شخصیت میں منسکر المزاجی، سادگی، شریف النفسی، مہمان نوازی، اور اخلاص و محبت جیسی صفات نظر آتی ہیں۔ کہا جاتا ہے نام کا شخصیت پر بہت اثر ہوتا ہے۔ ان کا نام چوں کہ حضرت یوسف اور حضرت شریف جیسے بزرگان دین کے نام پر رکھا گیا تھا اس وجہ سے ان کی شخصیت میں صوفیانہ و بزرگانہ صفات درآئی ہیں۔ وہ ہر کسی سے محبت و اخلاص سے ملتے ہیں۔ ان کے حسن سلوک کا ہر کوئی قائل ہو جاتا ہے۔ مہمان نوازی میں حیدرآبادی تہذیب کے نمائندہ نظر آتے ہیں۔ غرض ان کی شخصیت پر ایک تو ان کے گھر کے علمی و ادبی ماحول کا اثر تھا دوسرے ان کی شخصیت پر ان بزرگان دین کے ناموں کی برکت کا اثر تھا کہ وہ آج بھی خلوص و انکساری اور شرافت کا پیکر نظر آتے ہیں۔

''بیسویں صدی میں اردو ناول'' کے نام سے ضخیم اور معرکۃ الآرا کتاب لکھنے والے یوسف سرمست کے بارے میں غائبانہ یہ تصور ہوتا ہے کہ وہ کافی لحیم شحیم، لمبی پوری شخصیت کے مالک ہوں گے لیکن حقیقت اس کے برخلاف ہے۔ یوسف سرمست چھریرے بدن کے دبلے پتلے نازک لیکن چست اور تندرست شخصیت کے مالک ہیں۔ سرخ و سفید رنگ، ستواں ناک، ذہین اور چمکدار آنکھیں، چوڑی پیشانی، کھڑا چہرہ جو دیکھنے میں بڑا جاذب نظر دکھائی دیتا ہے۔ سر کے بال عجیب انداز میں بکھرے ہوئے جس میں ایک بناؤ کی کیفیت ہوتی ہے۔ ان کے حلیہ کے بارے میں ان کے ایک شاگرد محمد شفاعت علی ایک مضمون میں یوں رقم طراز ہیں:

> ''ڈاکٹر صاحب سادگی اور ملنساری، خلوص و ہمدردی اور اخلاق و
> شرافت کا پیکر ہیں۔ کھڑا چہرہ، ناک لانبی، پیشانی چوڑی، موٹے

شیشے والی عینک، موٹے اور گھرے مونچھ رکھتے ہیں۔ بال ہمیشہ بکھرے ہوئے ہوتے ہیں لیکن اس بکھراؤ میں بعض وقت درمیان میں ہلکی سی مانگ بھی نظر آتی ہے۔ بات چیت یا تقریر کے دوران بار بار پیشانی پر سے بالوں کو ہٹاتے رہتے ہیں۔ دوران گفتگو وہ اچانک کسی خاص نکتہ پر آکرا یکدم رک جاتے ہیں اور ساتھ ہی اپنے سر، گردن اور ہاتھوں کواس طرح جنبش دینے لگتے ہیں کہ جس سے پتہ چل جاتا ہے کہ وہ آگے کیا کہنا چاہتے ہیں اور پھر فوراً ہی جملہ مکمل کر لیتے ہیں۔''[1]

یوسف سرمست کی ایک ساتھی بیگم آمینہ انصاری ہیں جو حیدرآباد کے انوارالعلوم کالج میں بحیثیت پرنسپل کافی عرصہ خدمات انجام دیں۔ بیگم آمینہ انصاری نے جامعہ عثمانیہ کے ''جشن الماس'' کے موقع پر شعبہ اردو سے شائع کردہ رسالہ ''ارمغان'' کے لیے ''آرٹس کالج سے کالج تک'' کے عنوان سے مضمون لکھا ہے جس میں محترمہ نے اپنے ساتھیوں، دوستوں اور اساتذہ کا خاکہ لکھا ہے۔ اپنے ساتھی یوسف سرمست کے بارے میں وہ لکھتی ہیں:

''یہ سامنے سے کون چلا آ رہا ہے بھئی، سوٹ پہنے ہوئے سر پر تنکوں کی ہیٹ اوڑھے، چشمہ لگائے دبلا پتلا پستہ قد، ارے یہ تو ''بھیا'' ہے۔ یعنی ڈاکٹر یوسف شریف الدین عرف یوسف سرمست ریڈر شعبہ اردو انہیں ہم شروع سے بھیا کہتے رہے ہیں۔''[2]

یوسف سرمست کو ان کے ساتھیوں کا ''بھیا'' کہنا دراصل ان کی شخصیت و سیرت شریفانہ صفت کا پتہ دیتا ہے جس سے ان کی شخصیت کی شریف النفسی اور نیکی جھلکتی ہے۔ ''بھیا'' کے تعلق سے تفصیل جاننی

---

[1] محمد شفاعت علی، ڈاکٹر یوسف سرمست، روزنامہ منصف، مورخہ ۱۷ جنوری ۱۹۸۲ء

[2] بیگم آمنہ انصاری، مضمون آرٹس کالج سے آرٹس کالج تک مشمولہ ارمغان۔

چاہی تو یوسف صاحب ایک انٹرویو میں فرماتے ہیں کہ ''دراصل میرے والد مجھے ''بھیا'' کہہ کر پکارتے تھے اس طرح ادبی حلقوں میں بھی ''بھیا'' کے نام سے پکارا جانے لگا۔'' اقبال متین نے اپنے چچازاد بھائی یوسف سرمست پر ایک خاکہ ''بھیا'' ہی کے عنوان سے لکھا ہے۔ یوسف سرمست کی ادبی شخصیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''ڈاکٹر یوسف سرمست کا نام آج میرے لیے ایک معتبر ادبی شخصیت کا نام بن گیا ہے ورنہ یوسف سرمست میری نظر میں آج بھی وہی سیدھے سادھے معصوم سے یوسف شریف الدین جو طالب علمی کے زمانے سے آج تک اسم بہ مسمّٰی ہیں۔''[1]

کسی بھی فرد کی شخصیت کا ''سیدھے سادھے'' اور ''معصوم'' ہونا جنہیں ان کے ساتھی ان کی شرافت نفس کی بناء پر ''بھیا'' کہتے ہوں اور جو اسم بہ مسمّٰی بھی ہوں اس شخصیت کے عادات واخلاق یقیناً مثالی ہوں گے۔ چونکہ یوسف سرمست کی تعلیم وتربیت جاگیردارانہ اشرافیہ گھرانے میں مشرقی تہذیب کے اصولوں پر ہوئی ان کے عادات بھی اسی لیے تہذیب وتمدن کے پروردہ ہیں۔ وہ ایک نیک خو، نرم گفتار، مہمان نواز، دوست پرست، رحم دل اور ہنس مکھ واقع ہوئے ہیں۔ ان کی یہی اعلی صفات ہیں جن کی بناء پر ان کے گھر والے انہیں کبھی ''صوفی'' تو کبھی ''بھیا'' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

یوسف سرمست کے عادات واخلاق بیان کرتے ہوئے ان کی استاد پروفیسر رفیعہ سلطانہ فرماتی ہیں:

> ''میں ایک عرصہ سے یوسف سرمست کو جانتی ہوں۔ کسی بھی شخص کی پہچان یہ ہوتی ہے کہ وہ ہر ایک شخص کے ساتھ اس کی حیثیت کے متعلق برتاؤ کرے۔ چنانچہ بیوی، بچوں، شاگردوں، اساتذہ وغیرہ کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے یہ دیکھا جائے۔ یوسف سرمست

---

[1] اقبال متین، ''بھیا''، مشمولہ ''سوندھی مٹی کے بت''، ص: ۲۲۲

باخلاق، ذہین، سعادت مند ہیں۔ دوستوں سے اچھا سلوک کیا کرتے ہیں۔ ہرایک کی حیثیت کے مطابق وہ پیش آتے ہیں۔تمام اساتذہ ان کو پسند کرتے ہیں۔موجودہ زمانے کے سب اساتذہ ان کی علمیت،محنت،لگن کے معترف رہے ہیں۔وہ بحیثیت استاد اچھی شخصیت کے مالک ہیں ان کی شخصیت میں اعتدال ہے۔ یوسف سرمست کے کردار میں کوئی کوتاہی نظر نہیں آتی جس سے میں اعتراض کرسکوں۔ وہ بظاہر مولوی نہیں ہے۔لیکن مذہبی عقائد پختہ رکھتے ہیں۔ میں جہاں تک درست سمجھتی ہوں کہ ماحول کی سازگاری نے ان کی شخصیت کی تعمیر میں کافی حدتک مدد کی ہے۔ یوسف سرمست کے عادات واطوار بہت سلجھے ہوئے ہیں۔ مذہبی اصولوں کا پاس ولحاظ بہت رکھتے ہیں۔''[1]

انسان اس وقت باخلاق اور سعادت مند بنتا ہے جب وہ خود طبع سلیم کا مالک ہوجس کی طبیعت میں حلم وبردباری کے ساتھ ساتھ عاجزی وانکساری ہواور سنجیدگی اوراعتدال جس کا زیور ہو۔

پروفیسر رفیعہ سلطانہ جامعہ عثمانیہ کی سب سے سینئر پروفیسر تھیں۔وہ جامعہ کی پہلی ڈین فیکلٹی خاتون بھی تھیں۔ یوسف سرمست ان سے بہت چھوٹے تھےلیکن جن الفاظ میں رفیعہ سلطانہ نے اپنے شاگرداور ایک جونیئر استاد کے عادات واخلاق کی تعریف کی ہے وہ یوسف سرمست کے لیے کسی انعام یا تمغہ سے کم نہیں ہے۔

عادات واخلاق

یوسف سرمست کے عادات واطوار کی تعمیر گھر کے خوشگوار اورعلمی وادبی ماحول میں ہوئی۔بچپن ہی

---

[1] پروفیسر یوسف سرمست،شخصیات از عابد سلطان شاہین،رہنمائے دکن مورخہ ۱۲۰کتوبر ۱۹۸۶ء

سے انہوں نے اپنی شخصیت کی چھاپ نمایاں کردی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے دوست احباب بچپن ہی سے انہیں ''صوفیانہ مزاج'' کا حامل قرار دیتے تھے۔ ان کے بچپن کے ساتھی اور تایازاد بھائی اقبال متین لکھتے ہیں:

''یوسف سرمست کا بچپن صوفیانہ طرز کا تھا۔ نہ کسی سے لڑنا جھگڑنا نہ کسی بات پر ضد کرنا۔ زندگی کی ہر پریشانی سے اس طرح سمجھوتے کرلینا جیسے کوئی خوشی مل گئی ہو۔ کبھی کوئی بے جا فرمائش کرکے انہوں نے اپنے والدین کو پریشان نہیں کیا۔ اسکول میں داخل کرائے گئے تو کتابوں کو ہی اوڑھنا بچھونا سب کچھ سمجھ لیا۔ پرائمری سے میڈل اسکول تک یوسف سرمست کا صوفیانہ لڑکپن وہی ترک تمنا کی منزل طے کرتا رہا۔''[1]

یوسف سرمست کے صالح اخلاق ہی کا نتیجہ ہے کہ وہ اپنی جوانی میں بھی معصوم لڑکا نظر آتے تھے۔ آج اکاسی برس کی عمر میں بھی باوجود ضعیفی ان کے چہرہ پر ایک طرح کی معصومیت دکھائی دیتی ہے۔ وہ جو اسلام میں کہا گیا ہے تمہارے اعمال تمہارے چہروں سے ظاہر ہوں گے۔ یوسف سرمست کے صالح اعمال اور اخلاق ان کے چہرے سے پڑھے جاسکتے ہیں۔ ان کے اخلاق و کردار کی خوبیوں کے سبھی قائل ہیں وہ آج بھی حیدرآباد تہذیب کی نمائندہ شخصیت نظر آتے ہیں۔

لباس

لباس سے انسان کی شخصیت کا اظہار ہوتا ہے اسی سے انسان کی سماجی حقیقت اور رتبے کا بھی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ یوسف سرمست نے جتنی نفاست پسند طبیعت پائی ہے۔ ان کا لباس بھی اسی طرح نفیس اور اعلیٰ درجہ کا ہوتا ہے۔ جامعہ عثمانیہ کے اساتذہ اور طالب علموں کا لباس ۱۹۴۸ء تک کُرتا پاجامہ اور

---

[1] اقبال متین، سوندھی مٹی کے بت، ص: ۲۲۰

شیروانی ٹوپی ہوا کرتا تھا۔ بعض اساتذہ جو سائنس اور انگریزی ادب سے متعلق تھے وہ کبھی کبھی سوٹ بھی زیب تن کرتے تھے۔ ڈاکٹر یوسف سرمست چونکہ لباس کے معاملہ میں حساس تھے اسی لیے انہوں نے سوٹ ہی کو اپنے لیے ترجیح دی۔ عموماً وہ امریکن طرز کا سوٹ پہننا پسند کرتے تھے لیکن پتلون ہمیشہ تنگ پائینچوں ہی کا ہوتا ہے۔ امریکن طرز سے یہ مراد ہے کہ اس میں یورپ کی طرح کوٹ کے اندر جیا کٹ نہیں پہنا جاتا ہے۔ سوٹ کے علاوہ سفاری بھی ان کا پسندیدہ لباس ہے۔ کبھی کبھی (گرمی کے موسم میں) وہ پتلون بشرٹ بھی زیب تن کرتے ہیں لیکن شرٹ کو ہمیشہ ان کرتے ہیں۔ گھر میں ان کا لباس سفید یا پھر ہلکے زرد رنگ کا ڈھیلا ڈھالا کرتا پائیجامہ ہوتا ہے۔

غذا

یوسف سرمست کی غذا کے بارے میں جب میں نے جاننے کی کوشش کی تو مجھے یہ چیز دیکھنے کو ملی کہ وہ سیدھی سادی غذا کھانا پسند کرتے ہیں۔ گوشت سے انہیں زیادہ رغبت نہیں ہے۔ البتہ مرغ کا گوشت پسند کرتے ہیں اور شوق سے کھاتے ہیں۔ ہر موسم کا پھل انہیں پسند ہے اور ان کی غذا کا یہ ایک لازمی جز ہوتا ہے۔ اکثر وہ اپنے کھانے میں روٹی کے ساتھ ترکاری، انڈا اور دال (ہر قسم) کی استعمال کرتے ہیں۔ انہیں مچھلی بھی بہت پسند ہے۔ وہ ہفتے میں دو یا تین بار ابتداء میں مچھلی کھاتے تھے۔ انہیں پھل کیوں زیادہ پسند ہے پوچھے جانے پر وہ ایک انٹرویو میں بتاتے ہیں کہ:

> ”میں پھل بہت پسند کرتا ہوں۔ لازمی طور پر بچپن سے عادت تھی۔
> میرے والد بھی پھلوں کے شوقین تھے۔ اس زمانے میں موز (کیلا)
> لازمی طور پر دوپہر اور شام میں کھانے کے بعد کھایا کرتے تھے۔“[۱]

---

۱ شخصی انٹرویو، پروفیسر یوسف سرمست، کنعان۔ II، جوبلی ہلز، جرنلسٹ کالونی، حیدرآباد، ۹ جولائی ۲۰۱۷ء

مشاغل اور پسند ناپسند

یوسف سرمست کا تعلق حیدرآباد کے اعلیٰ طبقے یا جاگیردارانہ طبقے سے ہے۔لیکن ان میں ظاہری نام ونمود نہیں تھا بلکہ وہ نہایت سادہ طبیعت واقع ہوئے ہیں۔شرافت اور نفاست ان کی طبیعت کا خاصہ ہے۔وہ لباس کے انتخاب میں جتنے مہذب ہیں رنگوں کے انتخاب میں بھی مہذب اور شائستہ ہیں۔انہیں ہلکے رنگ بہت پسند ہیں۔خصوصاً ہلکا زرد رنگ (Creame Colour) بہت پسند ہے۔اس کے علاوہ وہ نوابی یا جاگیردارانہ طبقے سے تعلق رکھنے کے باوجود سگریٹ وشراب نوشی جیسی عادتوں سے کوسوں دور رہتے ہیں لیکن انہیں پان بہت پسند ہے جسے وہ صبح وشام کھانے کے بعد شوق سے کھایا کرتے تھے لیکن اب نہیں کھاتے۔انہوں نے اپنے ایک انٹرویو میں سگریٹ نوشی کے بارے میں سوال کئے جانے پر بتایا کہ:

> ''میں نے سگریٹ کبھی نہیں پیا۔ہاں ایک زمانے میں شادی کے بعد صبح وشام چائے کے بعد پابندی کے ساتھ پان کھاتا تھا۔ایک مدت تک پاندان بھی تھا لیکن بعد میں صحت کے تعلق سے سوچ کر چھوڑ دیا۔''[1]

یوسف سرمست کے مشاغل میں چہل قدمی بھی شامل ہے۔وہ ہر روز صبح بیدار ہونے کے بعد ایک آدھ گھنٹہ چہل قدمی میں لگاتے ہیں۔یہ عادت انہیں بچپن ہی سے ہے کیوں کہ ان کے والد روزانہ انہیں صبح سویرے جگا کر پیدل دو یا تین کیلومیٹر تک لے جاتے تھے۔جس کی وجہ سے یہ روزانہ ان کا معمول بن گیا تھا لیکن اب ضعیفی اور کمزوری کی وجہ سے وہ چہل قدمی نہیں کر پاتے لیکن آج بھی صبح سویرے اٹھ جاتے ہیں اور تھوڑا بہت ٹہل لیتے ہیں۔

یوسف سرمست کے مشاغل میں مطالعہ کا شوق بھی ہے۔وہ اکثر اپنے مطالعہ کے لیے تنہائی پسند

---

[1] شخصی انٹرویو، پروفیسر یوسف سرمست، کنعان۔II، جوبلی ہلز، جرنلسٹ کالونی، حیدرآباد، ۹ جولائی ۲۰۱۷ء

کرتے تھے۔ وہ اوائل میں اپنی کوٹھی کی دوسری منزل پر ایک کمرے میں پڑھا کرتے تھے۔ پھر جب مغل پورہ سے یاقوت پورہ چلے گئے تو وہاں پر بھی الگ کمرے میں پڑھا کرتے تھے۔ اس کے بعد جب اپنا مکان ''کنعان۔1'' جوبلی ہلز روڈ نمبر۱۳ پر پڑھائی کرتے تھے تو وہاں بھی دوسری منزل میں اس روایت کو جاری رکھا۔ اس لیے کہ وہاں ذات الٰہی کی طرف وہ اکثر مشغول ہوتے تھے۔ وہ عموماً ایک کتاب دو یا تین دن میں ختم کرتے تھے۔ وہ جب کسی کتاب میں نئی معلومات دیکھتے تھے تو اسے فوراً نوٹ کر لیتے تھے یہ بھی ان کے معمول کا ایک حصہ بن گیا ہے۔ یہی سلسلہ اب تک جاری ہے جب بھی وہ نئی بات، نئی چیز دیکھتے ہیں تو اسے لکھتے رہتے ہیں۔ شاعری ہو، افسانہ ہو، ناول ہو یا ڈراما یا خاکہ غرض سب کا مطالعہ شوق سے کرتے ہیں۔ ان کا حافظہ بھی بہت تیز ہے۔ ان کے مطابق انہوں نے تقریباً نو سو سے زائد کتابوں کا مطالعہ کیا ہے۔ وہ انگریزی کے علاوہ فارسی اور تلگو زبانوں سے بھی اچھی طرح واقف ہیں اور ان میں بھی چیدہ چیدہ لکھتے رہتے ہیں۔ مگر انہوں نے اردو کو ہی اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا ہے اور اسی کے لیے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ صرف کرتے ہیں۔ وہ تنقید و تحقیق کا شغف رکھتے ہیں۔ تنقید کا بہت گہرا مطالعہ ہے اور تحقیق پر وسیع نظر ہے اس سلسلے میں عبدالقادر سروری آپ کو "Veracious Reader" کہا کرتے تھے۔

حلقۂ احباب

یوسف سرمست کے دوست زیادہ نہیں ہیں۔ البتہ جو بھی ہیں وہ اردو دنیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ اردو داں طبقے کے افراد سے بھرپور واقفیت رکھتے ہیں۔ ان کے ابتدائی دور کے ساتھیوں میں جوسٹی کالج کے ساتھی ہیں سعد حسین، محمد اکبرالدین صدیقی، حمیدالدین محمود، نواب غیاث صدیقی اور خلیل الرحمٰن کے نام اہمیت رکھتے ہیں۔ ان تمام حضرات نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور اہم مقامات پر فائز رہے۔ جناب سید حسین نے آئی اے ایس کیا تھا اور حکومت آندھراپردیش کے اہم عہدہ پر خدمات انجام دیں۔ محمد اکبر الدین صدیقی، اردو دنیا خصوصاً دکنی ادب کی تحقیق اور تنقید کا ایک اہم نام ہے۔ جنہوں نے اپنے ادبی کارناموں کے ذریعہ جامعہ عثمانیہ کا نام روشن کیا۔ حمیدالدین محمود نے انگریزی زبان پر عبور حاصل کیا اور

انگریزی صحافت وابستہ ہوئے۔ ملک کے اہم ترین اخباران کے مضامین شائع کرنے میں اپنی خوشی محسوس کرتے تھے۔نواب غیاث صدیقی حیدرآباد کے اچھے شاعر تھے۔خلیل الرحمٰن حکومت آندھراپردیش کے سکریٹریٹ میں اہم عہدوں پر فائز رہےاور پھرراجیہ سبھا کے ممبر ہوئے۔

یوسف سرمست اپنے اہم رتبہ اساتذہ میں ہی مقبول نہیں ہیں بلکہ وہ اپنے اسکالرز اور شاگردوں میں بھی ہردلعزیز ہیں۔ یہ وصف ان میں اس لیے پیدا ہوا کہ وہ علم کے حصول اور تعلیم کے فروغ سے بے انتہادلچسپی رکھتے ہیں۔

باب دوم

پروفیسر یوسف سرمست کے معاصر تنقید نگار

(حیدرآباد دکن کے حوالے سے)

یوسف سرمست کے معاصر تنقید نگار

یوسف سرمست کے معاصر تنقید نگاروں میں کئی نام ہیں جن کی خدمات اردو ادب میں اہمیت کی حامل ہیں۔ خصوصاً حیدرآباد کے حوالے سے جنہوں نے تنقیدی خدمات انجام دیں وہ بحیثیت محقق بھی اہمیت رکھتے ہیں۔ یہاں ان معاصر ناقدین کا مختصراً تعارف پیش کیا جارہا ہے۔

خواجہ حمید الدین شاہد

خواجہ حمید الدین شاہد ۱۴/ اکتوبر ۱۹۱۹ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام خواجہ شجاع الدین تھا۔ ۱۹۳۵ء میں دسویں جماعت کا امتحان اچھے نمبرات کے ساتھ پاس کیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر زور صاحب کے سایہ عاطفت میں آ گئے۔ جہاں وہ دس سال سے زائد ان کے مکان میں رہے۔ سٹی کالج سے انٹرمیڈیٹ اور بی اے کی کامیابی کے بعد ۱۹۴۴ء میں جامعہ عثمانیہ سے ایم اے پاس کیا۔ اس کے ساتھ ہی دو سال تک سنٹرل اسکول آف کامرس میں لکچرار دور ہے۔ ۱۹۴۷ء میں بحیثیت اردو لکچرر چادرگھاٹ کالج سے وابستہ ہوئے جہاں وہ ۱۹۵۹ء تک اردو اور ہندی لکچرر کی خدمات انجام دیتے رہے۔ ۱۹۵۹ء میں پاکستان منتقل ہو گئے۔ وہاں رہ کر بھی اردو کی خوب خدمت کرتے رہے۔ ۱۲۰ کتوبر ۲۰۰۰ء کو کراچی میں ان کا انتقال ہو گیا۔

حمید الدین شاہد کئی ایک علمی، ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں سے بھی وابستہ تھے اور کئی رسالوں کی مجلس مشاورت میں بھی شامل تھے۔ فائن آرٹس اکیڈیمی کے نائب صدر اور کئی انجمنوں کے معتمد اور رکن کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے۔

خواجہ حمید الدین شاہد کا شمار ڈاکٹر زور کے قابل فخر شاگردوں میں ہوتا ہے۔اس لیے ان میں یہ ساری خوبیاں تھیں کہ وہ بیک وقت محقق، نامور صحافی، استاد اور شاعر ہونے کے علاوہ صاحب طرز ادیب بھی تھے۔ وہ ادارہ ادبیات اردو کے روح رواں، ماہنامہ سب رس کے ایڈیٹر، فائن آرٹس اکیڈیمی حیدرآباد کے نائب صدر، ایک قابل منتظم اور کامیاب آرگنائزر تھے۔

حمید الدین شاہد کے زورِ قلم کا نتیجہ درج ذیل تصانیف رہیں:

۱۔ اردو میں سائنسی ادب ۲۔ رسالہ محمود وخوش دہاں
۳۔ مثنوی تصویر جاناں ۴۔ ارمغان امجد
۵۔ یادگارِ امجد ۶۔ یادگارِ صفی
۷۔ شمس الامرا کی سائنسی خدمات ۸۔ حیدرآباد کے شاعر (مرتب جلد اول)
۹۔ سرگذشت ادارہ ادبیات اردو ۱۰۔ نقوش ادب
۱۱۔ ادبی مطالعے (تنقیدی مضامین) ۱۲۔ اردو میں سائنسی ادب۔قدیم ترین کارنامے

حیدرآباد کے شاعر (حصہ اول) ۱۹۵۸ء میں شائع ہوئی جسے ساہتیہ اکیڈیمی حیدرآباد نے شائع کیا جس میں ۵۹ شاعروں پر مضمون اور نمونہ کلام شامل تھا۔

رسالہ محمود وخوش دہاں ۱۹۶۹ء دکنی تحقیق کے سلسلے کی یہ کتاب ایوان اردو کا کراچی سے شائع ہوئی۔

اردو میں سائنسی ادب (۱۵۹۱ء۔۱۹۰۰ء) ۱۹۶۹ء میں کراچی سے شائع ہوئی۔

حکیم الشعراء حضرت امجد حیدرآبادی ۱۹۹۵ء کراچی، تمتہ مثنوی خاورنامہ رستمی بیجاپوری مرتبہ شیخ چاند ابن حسین۔

ان تصانیف کے علاوہ مجلّہ عثمانیہ، شعور، سب رس اور ماہنامہ ''آجکل'' میں ان کے کئی تحقیقی مضامین شائع ہوئے۔ڈاکٹر لئیق صلاح نے خواجہ حمید الدین شاہد پر ایک جامع مضمون ''خواجہ ہندو پاک'' کے عنوان سے لکھا جو سب رس ۱۹۹۱ء میں شائع ہوا۔

خواجہ حمید الدین شاہد اور دکنی شاعر اعجاز حسین کھٹا کراچی سے ۲۳/نومبر ۱۹۹۵ء کو حیدرآباد آنے پر

ان کا شایان شان خیر مقدم کیا گیا۔ رسالہ ''شاداب'' حیدرآباد کے میر محمد قمرالدین صابری نے ان حضرات کی آمد پر شاداب کا خصوصی نمبر شائع کیا۔ کراچی واپس ہونے کے بعد شاہد صاحب ڈھلتی ہوئی عمر، بڑھتی ہوئی مصروفیت کی بنا پر علیل ہوگئے۔ ۲۳/ اکتوبر ۲۰۰۱ء کو ان کا انتقال کراچی میں ہوا۔ وہیں سپرد خاک ہوئے۔

پروفیسر مغنی تبسم

ہندوستان کے سرکردہ ناقدین اور شعرا میں پروفیسر مغنی تبسم کا شمار ہوتا ہے۔ وہ تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ وہ تنقید نگار، محقق، دانشور، صحافی اور قابل استاد ہیں۔ وہ نثر نگار کے ساتھ ساتھ بہت اچھے شاعر بھی ہیں۔ انہیں علم عروض پر کافی دسترس حاصل ہے۔

اصلی نام محمد عبدالمغنی ہے لیکن قلمی نام مغنی تبسم کے نام سے شہرت پائی۔ وہ ۱۳/ جون ۱۹۳۰ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد عبدالمغنی سب جج کے عہدے پر فائز تھے۔ محمد عبدالمغنی (مغنی تبسم) نے عثمانیہ یونیورسٹی سے بی۔اے پاس کیا اور اردو میں ایم۔اے کی ڈگری حاصل کی۔ پھر اس کے بعد فارسی ادب میں بھی ایم۔اے کی ڈگری حاصل کی۔ اردو میں مقالہ ''فانی بدایونی: حیات، شخصیت اور شاعری''، پروفیسر مسعود حسین خان کی زیر نگرانی تحریر کر کے ۱۹۶۶ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

مغنی تبسم کی ملازمت کی ابتداء ۱۹۵۲ء سے ہوئی۔ مختلف کالجوں میں پارٹ ٹائم لکچرر کی حیثیت خدمات انجام دینے کے بعد ۱۹۵۷ء میں شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی میں بحیثیت لکچرر تقرر رہا۔ ۱۹۶۹ء میں ریڈر اور ۱۹۸۳ء میں پروفیسر شپ ملی۔ اس درمیان سنٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد میں وزیٹنگ پروفیسر بھی رہے۔ ۱۹۸۸ء میں صدر شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی فائز ہوئے۔ اسی عہدے سے ۳۰/ جون ۱۹۹۰ء کو وظیفہ ملنے پر سبکدوش ہوئے۔

پروفیسر مغنی تبسم ہندوستان کے علاوہ انگلینڈ اور امریکہ بھی توسیعی لکچر کے سلسلے میں گئے۔ اردو دنیا میں وہ ایک ممتاز شاعر اور اعلی پایہ نقاد کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں۔ انہوں نے تحقیق و تنقید میں نئ

منزلیں تلاش کیں۔انہیں اسلوبیاتی تنقید کے بنیادگزاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔

جن اداروں سے وہ وابستہ رہے ہیں ان میں کچھ خاص اس طرح ہیں۔

۱۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

۲۔ انجمن ترقی پسند مصنفین

۳۔ نظامس ادبی ٹرسٹ

۴۔ ساہتیہ اکیڈیمی (دہلی) کی مجلس مشاورت

۵۔ ادارہ ادبیات اردو

اس کے علاوہ ماہنامہ ''سب رس'' اور ''شعر وحکمت'' کے مدیر کی حیثیت سے کام کرتے رہے اور اپنا کلام بھی شائع کرتے رہے۔ان کے مضامین علمی وادبی رسالوں میں شائع ہوتے رہے۔ان کی تصانیف میں بازیافت ۱۹۵۶ء، آواز اور آدمی ۱۹۹۲ء، لفظوں کے آگے ۱۹۹۳ء، تحسین شعر (تنقیدی مضامین کا مجموعہ)، بساط تنقید، تنقیدی مضامین کا مجموعہ، زبان وادب (تنقیدی مضامین کا مجموعہ)۔ان کی مرتب کردہ اور مترجم تصانیف فانی کی نادر تحریریں (۱۹۷۰ء)، فکر اقبال، کہانیاں، نذر فآنی بدایونی، انگریزی میں معاصر ہندوستانی کہانیاں، عصری ہندوستانی کہانیاں، تلگو ادب کی تاریخ پر ایک نظر، ہندوستانی مسلمان منزل کی تلاش میں، دکنی لغت اور دکنی مخطوطات۔اس کے علاوہ ان کا مقالہ ''فانی بدایونی حیات، شخصیت اور شاعری'' ۱۹۶۹ء میں منظر عام پر آیا۔یہ مقالہ فآنی پر اب تک حرف آخر کا درجہ رکھتا ہے۔

مغنی تبسم نے نظم اور غزل گوئی میں طبع آزمائی کی۔ان کی غزل گوئی کا اسلوب دلکش ہے جس میں عصری لفظیات اور جدید لہجے کے ساتھ کلاسیکی غزل کا رچاؤ بھی ملتا ہے۔ان کے شعری مجموعے نوائے تلخ (۱۹۵۶ء)، پہلی کرن کا بوجھ (۱۹۸۰ء)، مٹی مٹی میرا دل (۱۹۹۱ء)، درد کے خیمے کے آس پاس (۲۰۰۲ء) ہیں۔

پروفیسر مغنی تبسم نے پروفیسر آغا حیدر حسن کی تالیف کردہ ''دکنی لغت'' اور ''تذکرۂ دکنی مخطوطات'' کو بڑی دیدہ ریزی اور انہماک سے مرتب کیا جن کی اشاعت ۲۰۰۲ء میں عمل میں آئی۔

جن حضرات نے عثمانیہ یونیورسٹی میں پروفیسر مغنی تبسم کی زیرنگرانی پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں ان میں خاص نام کچھ اس طرح ہیں:

۱۔ ڈاکٹر اکبر علی بیگ

۲۔ ڈاکٹر علی احمد جلیلی

۳۔ ڈاکٹر قمر سلطانہ

۴۔ ڈاکٹر شفیعہ قادری

۵۔ ڈاکٹر شیخ عبدالرحمٰن انصاری

پروفیسر مغنی تبسم کا انتقال ۲۰۱۲ء کو حیدرآباد میں ہوا۔

ڈاکٹر سیدہ جعفر

سیدہ جعفر ۱۵ اپریل ۱۹۳۴ء کو کریم نگر ضلع میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد سید جعفر علی تھے۔ سیدہ جعفر کی شادی جناب احمد مہدی سے ہوئی۔

ڈاکٹر سیدہ جعفر حیدرآباد کی مایہ ناز علمی و ادبی شخصیت ہیں۔ ان کا شمار ہندوستان کی دانشور خواتین میں ہوتا ہے۔ وہ ایک اعلی پایہ اُستاد، ادیب، انشا پرداز، محقق، نقاد اور مخطوطہ شناس ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ دکنیات اور رثائی ادب پر گہری نظر رکھتی ہیں۔ وہ اپنا پی ایچ ڈی کا مقالہ بہ عنوان ''اردو مضمون کا ارتقاء'' پروفیسر عبدالقادر سروری کی زیرنگرانی جامعہ عثمانیہ سے ۱۹۵۹ء میں لکھ کر ڈگری حاصل کی۔ پھر وہ ۱۹۵۸ء میں نظام کالج میں اردو کی لکچرر مقرر ہوئیں۔ ۱۹۸۳ء میں پروفیسر اور ۱۹۸۴ء سے ۱۹۸۶ء تک صدر شعبہ اردو رہیں۔ اس دور میں انہوں نے سنٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد میں بھی کچھ مدت تک پروفیسر اور صدر شعبہ کے عہدے پر اپنی خدمات انجام دیتی رہیں۔ وہ چیرپرسن بورڈ آف اسٹڈیز، یو جی سی اور اکیڈیمک سنیٹ کی رکن بھی رہیں۔ ۱۹۹۴ء میں وظیفہ پر سبکدوش ہونے کے بعد انہیں مزید دو سال کی توسیع دی گئی۔

پروفیسر سیدہ جعفر ایک کثیر التصانیف ادیب ہیں۔ اردو نثر پر انہیں مکمل عبور حاصل ہے۔ ان کی تصانیف و تالیف حسب ذیل ہیں۔

۱۔ ماسٹر رام چندر اور اردو نثر کے ارتقاء میں ان کا حصہ (تحقیق)، ۱۹۶۰ء

۲۔ من سمجھاون ۱۹۶۴ء، (ترتیب و تدوین)

۳۔ فن کی جانچ (تنقید)، ۱۹۶۵ء

۴۔ دکنی رباعیاں (ترتیب و تدوین)، ۱۹۶۶ء

۵۔ تنقید اور انداز نظر (تنقید)، ۱۹۶۷ء

۶۔ سکھ انجن (ترتیب و تدوین)، ۱۹۶۷ء

۷۔ من سمجھاون (ہندی تدوین)، ۱۹۶۸ء

۸۔ یادگار مہدی (تدوین)، ۱۹۷۰ء

۹۔ اردو مضمون کا ارتقاء (تحقیق)، ۱۹۷۲ء

۱۰۔ دکنی نثر کا انتخاب (ترتیب و تدوین)، ۱۹۸۳ء

۱۱۔ مثنوی یوسف زلیخا (ترتیب و تدوین)، ۱۹۸۳ء

۱۲۔ ڈاکٹر زور (تحقیق)، ۱۹۸۴ء

۱۳۔ چندر بدن و مہیار (ہندی تدوین)، ۱۹۸۴ء

۱۴۔ کلیات محمد قلی قطب شاہ (ترتیب و تدوین)، ۱۹۸۵ء

۱۵۔ مثنوی ماہ پیکر، ۱۹۸۶ء

۱۶۔ اردو تنقید (تنقید)

۱۷۔ ویلا تھال (ترجمہ)

۱۸۔ دکنی ادب کا مطالعہ (بہ اشتراک ڈاکٹر افضل الدین اقبال)، ۱۹۹۰ء

۱۹۔ مہک اور محک (تنقید)

۲۰۔ فراقؔ گورکھپوری

۲۱۔ دکنی ادب کا انتخاب

۲۲۔ تاریخ ادب اردو ۱۷۰۰ء تک (پانچ جلدیں) بہ اشتراک گیان چند جین، ۲۰۰۰ء

۲۳۔ انتخاب کلام محمد قلی قطب شاہ

۲۴۔ جنت سنگار (ترتیب وتدوین)

۲۵۔ دکنی ادب میں قصیدے کی روایت

۲۶۔ مثنوی گلدستہ از صنعتی (ترتیب وتدوین)

۲۷۔ تاریخ ادب اردو (عہد میر سے ترقی پسند تحریک تک) چار جلدیں، ۲۰۰۲ء

۲۸۔ دکنی لغت

ڈاکٹر سیدہ جعفر کی ان تصانیف کے علاوہ سینکڑوں پر مغز نثر پارے، مضامین، مقالات، مختلف رسائل و جرائد اور اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان کا اردو اور انگیزی کا مطالعہ نہایت وسیع اور عمیق ہے۔ ان کے درس دینے کا طرز و طریقہ منفرد تھا۔

ان کے شاگردوں میں ڈاکٹر افضل الدین اقبال، ڈاکٹر لئیق صلاح، ڈاکٹر سلمیٰ بگرامی، ڈاکٹر مہر جہاں، ڈاکٹر سیدہ بیگم، ڈاکٹر شاہانہ امیر، ڈاکٹر عسکری صفدر، ڈاکٹر کوکب النساء اور ڈاکٹر عابد النساء وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ پروفیسر سیدہ جعفر پر تحقیقی کام ہوا ہے۔ ڈاکٹر امیر علی نے پروفیسر سیدہ جعفر کی شخصیت اور کارناموں پر پروفیسر افضل الدین اقبال کی نگرانی میں مقالہ لکھ کر عثمانیہ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے علاوہ شفیق النساء روبینہ کے مقالے ''پروفیسر سیدہ جعفر کے تحقیقی کارنامے'' پر انہیں گلبرگہ یونیورسٹی نے ۱۹۹۲ء میں ایم فل کی ڈگری دی۔

پروفیسر سیدہ جعفر کئی ایک علمی و ادبی اداروں سے بھی وابستہ رہیں۔ ان کی تحقیقی وتنقیدی کتابوں پر مختلف اکاڈمیوں اور اداروں نے انہیں انعامات سے نوازا۔ انہیں جو انعامات و اعزازات ملے۔ ان میں ڈاکٹر زور ایوارڈ، نوائے میر ایوارڈ، مخدوم ایوارڈ، بسٹ اردو اسکالر ایوارڈ اور قاضی عبدالودود ایوارڈ شامل

ہیں۔

سیدہ جعفر اردو دنیائے ادب کیلئے بیش بہا علمی و ادبی اثاثہ چھوڑ کر ۲۴ جون ۲۰۱۶ء کو اس دار فانی سے کوچ کر گئیں۔

پروفیسر حبیب ضیاء

حیدرآباد کی خواتین میں پروفیسر حبیب ضیاء کا نام محتاج تعارف نہیں۔ ان کی باوقار شخصیت علمی و ادبی حلقوں میں اہمیت رکھتی ہے۔ تحقیق، تنقید اور طنز و مزاح میں ان کے کارناموں نے اردو ادب میں خاصا اضافہ کیا۔ وہ بنیادی طور پر ایک شفیق استاد ہیں۔ انہوں نے تحقیق و تنقید کے علاوہ طنزیہ و مزاحیہ مضامین کثرت سے لکھے جن میں بلا کی چاشنی ہے۔

وہ یکم نومبر ۱۹۳۵ء میں حیدرآباد میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد مرزا ضیاء الدین بیگ تھے۔ حبیب ضیاء کے شوہر سید رحیم الدین توفیق تھے جو اچھے مزاح نگار، (کلاسیکی) کلاسکل موسیقی اور باغبانی میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ جامعہ عثمانیہ سے حبیب ضیاء نے ۱۹۵۹ء میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ پی ایچ ڈی کا مقالہ ''مہاراجہ کشن پرشاد حیات اور ادبی خدمات'' ڈاکٹر حفیظ قتیل کی نگرانی میں لکھا اور ۱۹۶۶ء میں حبیب ضیاء نے پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔

حبیب ضیاء درس و تدریس سے ۱۹۶۷ء میں جڑ گئیں۔ ان کا پہلا تقرر اورینٹل کالج میں بحیثیت لکچرر اردو ہوا۔ ۱۹۸۴ء میں ویمنس کالج کوٹھی میں حبیب ضیاء صاحبہ شعبہ اردو میں بحیثیت ریڈر نامزد ہوئیں۔ وہیں ترقی ہوتے ہوئے پروفیسر کے عہدے پر فائز ہوئیں اور صدر شعبہ بنائی گئیں۔ کالج کی وابستگی میں وہ بورڈ آف اسٹڈیز کی چیر پرسن بھی رہیں۔ ان کی موجودگی میں اس شعبہ نے کافی ترقی کی۔ ان کی محنت و مشقت سے یہ شعبہ کالج میں بام عروج تک پہنچ گیا۔ طالب علموں کے لیے ثقافتی و علمی، سماجی، ادبی وغیرہ قسم کے سمینار منعقد کئے۔

پروفیسر حبیب ضیاء کی شخصیت میں خوش اخلاقی، خلوص وانکساری، مروت و مہمان نوازی کا جذبہ بہ

درجہ اتم موجود ہے۔ وہ شہرت ونمود سے دور رہتی ہیں۔ ادبی محفلوں میں بھی شائستگی سے شریک ہوتی ہیں نہ تو کسی پر طنز کرتی ہیں اور نہ تعریف کرتی ہیں لیکن اپنے مزاحیہ مضامین میں وہ دوسروں کو ہنساتی ہیں۔ لیکن ان کے چہرے پر صرف مسکراہٹ نظر آتی ہے۔ وہ نہایت سنجیدہ اور متین خاتون ہیں۔ اپنے شاگردوں سے نہایت ہمدردی اور دوستانہ رویہ سے پیش آتی ہیں۔

انہوں نے جتنی تصانیف لکھی ہیں، وہ کچھ خاص اس طرح ہیں:

۱۔ دکنی زبان کے قواعد، ۱۹۶۴ء

۲۔ گوئم مشکل، ۱۹۸۱ء

۳۔ انیس بیس، ۱۹۸۸ء

۴۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد حیات اور کارنامے

۵۔ شاد و نیاز (مرتب)، ۱۹۹۳ء

۶۔ مژگاں اٹھایئے، ۲۰۰۰ء

۷۔ حیدرآباد کی طنز و مزاح نگار خواتین، ۲۰۰۶ء

۸۔ بڑے گھر کی بیٹی (خودنوشت سوانح)

۹۔ گلدستہ شاد غیر مطبوعہ غزلیں مرتب، ۲۰۰۹ء

۱۰۔ نذر شاد (سمینار کے مقالے)، ۲۰۰۹ء

۱۱۔ دکنی زبان کی قواعد، ۲۰۱۰ء

ڈاکٹر ثمینہ شوکت

ثمینہ شوکت ۱۹/ جون ۱۹۳۶ء کو گلبرگہ میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد کا نام سید منہاج الدین شوکت تھا۔ انہوں نے ۱۹۵۶ء میں ایم اے میں امتیازی کامیابی حاصل کی۔ بعد ازاں ۱۹۶۰ء میں تحقیقی مقالہ ''مہاراجہ چندولعل، شاداں حیات اور کارنامے'' پروفیسر عبدالقادر سروری کی نگرانی میں لکھ کر جامعہ

اسلامیہ سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۵۸ء سے درس وتدریس سے وابستہ ہوئیں اور ویمنس کالج کوٹھی حیدرآباد میں بحیثیت لیکچرر برسوں خدمات انجام دیتی رہیں۔ ۱۹۷۹ء بحیثیت ریڈر سنٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد سے وابستہ ہوئیں۔ یہیں پر بحیثیت پروفیسر اور صدر شعبہ اردو کے عہدے سے ۱۹۸۴ء میں وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئیں۔ ان کی علمی وادبی خدمات پر انہیں دو سالہ یو.جی.سی کی فیلوشپ کے لیے منتخب کیا گیا۔ وہ یہ اعزاز پانے والی ہندوستان کی پہلی خاتون پروفیسر جانی جاتی ہیں۔

ڈاکٹر ثمینہ شوکت دکنی محققین کی صف میں ایک قابل قدر مقام رکھتی ہیں۔ ان کے بے شمار علمی و ادبی کارنامے ہیں۔ ان کی دکنی تحقیق ادبی حلقوں میں اپنا ایک معیار رکھتی ہے۔ درس وتدریس کے میدان میں بھی وہ ایک بہترین استاد رہی ہیں۔ انہوں نے طلبہ کو دکنی تحقیق کی طرف راغب کیا۔ فی الحال وہ کینیڈا میں مقیم ہیں۔

پروفیسر ثمینہ شوکت کی تصانیف درج ذیل ہیں:

۱۔ ماہ لقا، ۱۹۵۹ء

۲۔ شکارنامہ از حضرت خواجہ بندہ نواز (تحقیق وتدوین)، ۱۹۶۲ء

۳۔ حیات لطف، ۱۹۶۲ء

۴۔ مثنوی نیرنگ عشق، ۱۹۶۲ء

۵۔ مہاراجہ چندولعل شاداں اور حیدرآباد کا سیاسی، سماجی پس منظر، ۱۹۷۹ء

۶۔ مہاراجہ چندولعل شاداں حیات اور کارنامے، ۱۹۸۴ء

۷۔ خدنگ جستہ (مضامین کا مجموعہ)

۸۔ اردو کی ترسیلی لسانیات (بہ اشتراک)

انہوں نے دکن کی اولین شاعرہ ''ماہ لقابائی چندا'' کو بحیثیت ایک ممتاز صاحب دیوان شاعرہ کے روپ میں اردو دنیا کے سامنے پیش کیا۔ ماہ لقا کے حالات زندگی کی کھوج کی اور مستند معتبر ماخذوں سے دریافت کیا اور اس کا کلام مختلف مخطوطات اور بیاضوں سے فراہم کر کے مرتب کیا۔ محقق وشاعر راحت

عزمی نے بھی اس موضوع پر ۱۹۹۸ء میں ''ماہ لقا: حالاتِ زندگی مع دیوان'' کے عنوان سے کتاب لکھی اورمزید معلومات مہیا کیں۔

''شکارنامہ'' کو ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے مخطوطات کی مدد سے مرتب کیا اور ایک جامع مقدمہ لکھتے ہوئے شکارنامہ کی وجہ تصنیف یہ بتائی کہ وحدت الوجود کی باریکی اور نزاکت کی وجہ سے یہ موضوع ہمیشہ ادق اور مشکل رہا۔اس لیے اسے آسان بنانے کے جو طریقے آزمائے گئے اس کا اثر شکارنامہ میں نظر آتا ہے۔انہوں نے حضرت خواجہ بندہ نواز کی ۲۱ تصانیف کا ذکر کیا ہے۔اسی زمانے میں مبارزالدین رفعت نے بھی ۱۹٦۳ء میں ''شکارنامہ'' کو مدون کیا۔

دکنی تحقیق کے سلسلے میں ثمینہ شوکت کے کئی مضامین اور مقالے مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوئے۔مثنوی لطف، دیوان لطف اور کلیات لطف ان کی دریافت ہیں۔اس کے علاوہ لالہ لچھمی نارائن شفیق جو چمنستان شعراء کے مصنف ہیں،ان کی اردو لغت بھی دریافت کی۔ثمینہ شوکت کے مضامین میں ''ڈاکٹر زور ایک عہد ایک عشق'' (ماہنامہ سب رس، مارچ ۱۹۸۵ء) اور ''شاعر کی نوا ہو کہ نفس ہو محمد قلی'' (سب رس، جون ۱۹۷۲ء) اہمیت رکھتے ہیں۔

ان کی تصانیف پر آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی کے علاوہ اتر پردیش،مغربی بنگال اور بہار کی اردو اکاڈمیوں نے ایوارڈ سے نوازا۔اے، پی اردو اکیڈیمی نے بیسٹ ٹیچر ایوارڈ اور میر اکیڈیمی نے امتیاز میر ایوارڈ عطا کیا۔درس وتدریس کے اس طویل عرصہ میں ان کے کئی شاگرد حصول علم سے سرفراز ہوئے۔ آپ کی نگرانی میں ڈاکٹر عطاء اللہ خاں اور ڈاکٹر نسیم الدین فریس جیسے نامور دکنی محققین نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔

پروفیسر ثمینہ شوکت کا انتقال ۱۵ مارچ جمعہ کے دن ۲۰۱۷ء کو کینیڈا میں ہوا۔

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید کا اصلی نام محمد سلیمان خاں ہے۔ بلکہ وہ اطہر جاوید کے نام سے اردو دنیا

میں جانے جاتے ہیں۔ وہ ۱۹/ اپریل ۱۹۳۶ء میں حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گورنمنٹ ہائی اسکول (مستعد پورہ) میں پائی۔ پھر۱۹۵۲ء میں گورنمنٹ ہائی اسکول (چادرگھاٹ) سے میٹرک کامیاب کیااور انٹرمیڈیٹ کی تکمیل کے بعد۱۹۵۹ء میں بی اےاور۱۹۶۲ء میں ایم اے (اردو) عثمانیہ یونیورسٹی سے حاصل کیا۔اس کے بعدعثمانیہ یونیورسٹی سے ہی پی ایچ ڈی کی ڈگری لی۔ ڈاکٹرمسعودحسین خان کی نگرانی میں مقالہ بہ عنوان ''رشیداحمدصدیقی: حیات اورفن'' کی لکھ کر پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔اس کے علاوہ لسانیات اورصحافت میں بھی مختلف ڈپلوماوسرٹیفکیٹس حاصل کیے۔

پروفیسرسلیمان اطہرجاویدکی ملازمت کا آغاز۱۹۶۳ء میں نظام کالج سے ہوا۔پھرایوننگ کالج اور بعد میں اورینٹل کالج میں ۱۹۶۶ءتک عارضی ملازمت سے وابستہ رہے۔ ۱۹۶۶ء میں سری وینکٹیشورا یونیورسٹی (تروپتی) میں بہ حیثیت لکچرر کے تقررعمل میں آیا۔ وہیں ریڈرپھر پروفیسر وصدرشعبہ اردو کے عہدے پرخدمات انجام دینے کے بعد۱۹۹۶ء میں وظیفہ پرسبکدوش ہوئے۔

پروفیسرسلیمان اطہر جاوید اپنی عملی زندگی کی ابتداء ہی سے مختلف انجمنوں واداروں سے وابستہ رہے۔ان اداروں میں مجلس عام (سینٹ) جامعہ اردو (علی گڑھ)،اردواکاڈمی (آندھراپردیش)،ترقی اردوبیورو،لینگوتیج ریڈرواڈوائزری کمیٹی (بھارتیہ گیان پیٹھ دہلی) اورادارہ ادبیات اردوقابل ذکر ہیں۔

پروفیسرسلیمان اطہر جاوید،محقق، نقاد، شاعراورصحافی کی حیثیت سے اردودنیا میں شہرت رکھتے ہیں۔وہ ایک کثیرالتصانیف ادیب ہیں۔ان کی تحقیقی وتنقیدی کتابوں پرانہیں کئی اعزازات وانعامات عطا کیے گئے۔جن میں آندھراپردیش اردواکادمی ایوارڈ اوراترپردیش اردواکادمی ایوارڈ اہم ہیں۔ان کی تصانیف رشیداحمدصدیقی حیات اورفن،۱۹۶۸ء، اسلوب اورانقاد، ۱۹۶۹ء،تنقیدشعر،۱۹۷۱ء، ادب میں ابہام اوراس کے مسائل،۱۹۷۴ء، چہرہ چہرہ داستان، ۱۹۷۷ء،تنقیدی افکار، ۱۹۷۷ء، تاریخ تلگو ادب اورفن لطیفہ،۱۹۷۸ء، مکاتب رشیداحمدصدیقی،۱۹۸۰ء، اردوشاعری میں اشاریت،۱۹۸۳ء،عزیز احمد کی ناول نگاری، ۱۹۸۶ء،تنقیداورتہذیب، ۱۹۸۷ء، رشیداحمدصدیقی۔۱۹۸۸ء،نقش بند، مرتبہ، ۱۹۹۱ء، اقبال مادرائے دیروحرم،۱۹۹۲ء، غالبؔ کے چندنقاد، ۱۹۹۵ء،عزیزاحمدکےافسانے،۱۹۹۶ءاور

دیوانِ غالب کا پہلا شعر،۲۰۰۳ء۔

اس وقت سلیمان اطہر جاوید علیلی ہیں اور اپنے فرزندوں کے ساتھ دبئی میں ہیں۔

ڈاکٹر لئیق صلاح

لئیق صلاح جن کا اصلی نام لئیق خدیجہ ہے۔ وہ ۱۰/ فروری ۱۹۳۸ء کو بمقام حیدر آباد پیدا ہوئیں۔ والد کا نام صلاح بن شمشیر یاور جنگ تھے۔لئیق صلاح کی ابتدائی تعلیم گورنمنٹ اسکول (نامپلی) میں انجام پائی۔ اسی اسکول سے ۱۹۵۶ء میں میٹرک کامیاب کیا۔ ویمنس کالج سے ۱۹۶۱ء میں گریجویشن کی تکمیل کے بعد ۱۹۶۶ء میں خانگی طور پر ایم اے اردو کی تعلیم حاصل کی۔ جامعہ عثمانیہ سے ۱۹۷۸ء میں ایم فل کی تکمیل کی۔ انہیں ایم فل کی سند ''میر شمس الدین فیض، شخصیت اور شاعری'' کے موضوعات پر ملی۔ ۱۹۸۲ء میں ڈاکٹر سیدہ جعفر کی نگرانی میں مقالہ ''ارسطو جاہ کے عہد کی ادبی خدمات'' کو قلم بند کر کے جامعہ عثمانیہ سے پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔

تعلیم کی تکمیل کے بعد عثمانیہ یونیورسٹی کے ملحقہ کالجوں میں جز وقتی لکچرر کی حیثیت سے فرائض انجام دیں۔ اس کے بعد بی بی رضا ڈگری کالج (گلبرگہ) میں لکچرر کی عمل آوری ہوئی۔ چند سالوں بعد شعبہ اردو، گلبرگہ یونیورسٹی منتقل ہوگئیں۔ وہیں ریڈر، پروفیسر و صدر شعبہ کی حیثیت سے خدمات انجام دیتی رہیں اور ۱۹۹۸ء میں وظیفہ پر سبکدوش ہوگئیں۔

ڈاکٹر لئیق صلاح کا شمار دکن کی مشہور و معروف خواتین میں ہوتا ہے۔ قدیم ادب و تہذیب کی بازیافت ان کا خصوصی موضوع رہا ہے۔ دکنی ادب پر ان کے بے شمار مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ علمی و ادبی خدمات کی بنا پر وہ صدر شعبہ اردو گلبرگہ یونیورسٹی، صدر کرناٹک اردو اکادمی بنگلور اور رکن قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان رہ چکی ہیں۔

وہ اپنے شاگردوں کے تئیں ایک قابل ترین استاد اور ہمدرد و شفیق رہ چکی ہیں۔ وہ ایک محقق، ادیب، نقاد اور دانشور حیدر آباد کی صف اول خواتین میں شمار ہوتی ہیں۔ وہ اپنے موضوع پر بڑی تلاش و

جستجو، محنت اور عرق ریزی سے تحقیق کرتی ہیں۔ تحقیق وتنقید کے علاوہ انہوں نے طنز و مزاح نگاری میں بھی ایک خاص مقام حاصل کیا۔ ان کی تصانیف حسب ذیل ہیں۔

۱۔ میر شمس الدین فیض حیات اور ادبی کارنامے (تحقیق)، ۱۹۸۰ء

۲۔ سنی سنائی (طنز و مزاح)، ۱۹۸۱ء

۳۔ عہد ارسطو جاہ کی علمی و ادبی خدمات (تحقیق) ۱۹۸۶ء

۴۔ عکس در عکس (تحقیقی وتنقیدی مضامین)

۵۔ نقد و جستجو (تنقیدی مضامین)، ۱۹۹۶ء

۶۔ خزائن الامثال (از سید شمس الدین فیض) مرتبہ

۷۔ تار نفس

۸۔ ارسطو جاہ از تمکین کاظمی (مرتبہ)

ڈاکٹر لئیق صلاح کے تحقیقی مضامین جو ماہنامہ سب رس حیدرآباد میں شائع ہوئے۔ ان میں یہ مضامین قابل ذکر ہیں:

''فیض جاری'' یہ مضمون صوفی شاعر شمس الدین فیض کے فکر وفکن پر ایک مبسوط جائزہ ہے۔ (مشمولہ سب رس، جولائی ۱۹۷۸ء)

''دبستان گولکنڈہ''، سب رس، مارچ ۱۹۷۶ء

''ڈاکٹر زور کی ادبی خدمات''، سب رس، دسمبر ۱۹۷۶ء

''ارباب نظم ونثر بیجاپور''، سب رس، مارچ ۱۹۷۷ء

''عظمت النساء بیگم باقرہ'' سب رس، نومبر ۱۹۷۸ء

''چمنستان شعراء'' (از شفیق)، سب رس، جون ۱۹۸۴ء

''عہد بہمنی کی علمی و ادبی خدمات''۔ سب رس، جولائی ۱۹۸۷ء

مضمون۔ ''طنز و مزاحیہ ادب ۱۹۷۰ء کے بعد'' (مشمولہ ماہنامہ شگوفہ، اگست ۲۰۰۶ء)

اس کے علاوہ ''کلیات ولیؔ'' مرتبہ نورالحسن ہاشمی قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی، ۲۰۰۸ء میں ڈاکٹر لئیق صلاح نے نہایت جامع اور مبسوط دیباچہ ''حرفِ چند'' کے عنوان سے لکھا۔

ڈاکٹر لئیق صلاح کو کوئی انعامات اور اعزازات سے نوازا گیا۔ میرا کادمی لکھنو کا اعزاز ۱۹۸۴ء میں حاصل ہوا۔ ان کی کتابوں پر آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی کے علاوہ یو پی اردو اکادمی اور بہادر اردو اکادمی نے ایوارڈز عطا کیے۔ اس کے علاوہ وہ بزم خواتین، حیدرآباد کرناٹک فرنٹ، انجمن ترقی اردو (ہند) شاخ گلبرگہ، انجمن اساتذہ ہندو غیرہ اداروں سے وابستہ رہی ہیں۔

حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی سے نشاط تہنیت تمکین نے مقالہ برائے ایم فل ''پروفیسر لئیق صلاح وادبی خدمات'' لکھ کر ۲۰۰۲ء میں ڈگری لی۔ گلبرگہ یونیورسٹی سے ڈاکٹر مجیب خاں نے مقالہ برائے پی ایچ ڈی لئیق صلاح کی علمی وادبی خدمات کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ'' سپرد قلم کر کے ۲۰۰۷ء میں ڈگری حاصل کی۔

ڈاکٹر اشرف رفیع

مایہ ناز نقاد، ادیبہ، محقق، شاعرہ اور اعلی پایہ کی مدرس کا جنم دکن میں ہوا۔ ۱۴/ اگست ۱۹۴۰ء کو اشرف رفیع کی ولادت سرزمین حیدرآباد میں ہوئی۔ ان کے والد محمد رفیع الدین صدیقی اردو اور فارسی کے مشہور شاعر تھے۔ اشرف رفیع کے شوہر ڈاکٹر مصطفیٰ علی خان فاطمی جامعہ عثمانیہ میں ریفرنس لائبریرین (Refrences Librarian) رہے۔ وہ خود بھی ایک اچھے اسکالر گزرے ہیں۔ اشرف رفیع نے ۱۹۶۵ء میں اردو میں ایم اے پاس کیا۔ پروفیسر مسعود حسین خان کی رہبری میں مقالہ ''نظم طباطبائی حیات اور کارناموں کا تنقیدی جائزہ'' لکھا۔ لیکن ۱۹۶۹ء میں پروفیسر رفیعہ سلطانہ کی زیر نگرانی میں یہ مقالہ مکمل کر کے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ بحیثیت اردو لکچرر ''ونیتا مہا ودیالیہ'' میں ۱۹۷۰ء میں تقرر ہوا۔ اس ادارے میں وہ آٹھ سال تک درس وتدریس کے کاموں میں مشغول رہیں۔

یکم نومبر ۱۹۷۷ء کو جامعہ عثمانیہ میں اشرف رفیع کا تقرر بحیثیت لکچرر رہا۔ ۱۹۸۴ء میں ریڈر مقرر ہوئیں۔ ۱۹۸۹ء میں پروفیسر شپ ملی اور ۱۹۹۰ء میں صدر شعبہ اردو کے عہدہ پر فائز ہوئیں۔ ۱۹۹۲ء میں

بورڈ آف اسٹیڈیز (B.O.S) کی چیر پرسن بنائی گئیں۔ زمانہ صدارت میں تانیثیت (Faminism) دکنی مثنویوں اور جنوبی ہند میں منظر پس منظر پر تین کل ہند سمینار کا انعقاد کیا۔ ۱۹۹۶ء میں پروفیسر اشرف رفیع دوبارہ صدر شعبہ مقرر ہوئیں۔

۳۱/ دسمبر ۱۹۹۷ء کو بحیثیت صدر شعبہ اردو ملازمت سے سبکدوش ہوئیں۔ وہ بحیثیت شاعرہ قومی سطح پر اپنی ایک پہنچان رکھتی ہیں۔ اس کے علاوہ دکنیات اور لسانیاتی تحقیق میں انہیں اہم مقام حاصل ہے۔ اشرف رفیع کی شخصیت پرکشش اور دلکش ہے۔ طالب علم ان سے بار بار ملنے کے خواہاں رہتے ہیں۔ وہ ایک پرخلوص، ہمدرد، حرکیاتی اور وقت کی پابند خاتون ہیں۔ اپنے شاگردوں کی تخلیقی صلاحیتوں کو سنوارنے اور نکھارنے میں انہیں کمال حاصل ہے۔ ان کے شاگردوں میں جو خاص اہمیت کے حامل ہیں ان کے اسم گرامی کچھ اس طرح ہیں:

۱۔ ریحانہ سلطانہ
۲۔ ڈاکٹر عتیق اقبال
۳۔ ڈاکٹر قطب سرشار
۴۔ ڈاکٹر عسکری صفدر (راقمہ)
۵۔ ڈاکٹر محمد ناظم علی
۶۔ ڈاکٹر ریاض فاطمہ
۷۔ ڈاکٹر سردار گربچن سنگھ
۸۔ ڈاکٹر فریدہ وقار
۹۔ ڈاکٹر فعت سلطانہ
۱۰۔ ڈاکٹر معین الدین امر
۱۱۔ ڈاکٹر انجم سلطانہ
۱۲۔ ڈاکٹر احمد اللہ بختیاری
۱۳۔ ڈاکٹر عبدالشکور قابل ذکر ہیں۔

پروفیسر اشرف رفیع کی زیر نگرانی میں ۱۶ طالب علموں نے ایم فل اور چودہ اسکالرز نے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

اشرف رفیع ایک ہمہ گیر شخصیت ہیں۔ عالم فاضل، دانشور قابل منتظم اور بہترین مقرر ہیں۔ اس کے علاوہ آرٹ اور موسیقی سے بھی انہیں خاصی دلچسپی ہے۔ ستار بجانے میں انہیں کمال حاصل ہے۔ ان کا شمار عصر نو کی اہم اور دانشور شاعرات میں ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اشرف رفیع نے سب سے پہلے نسائی

حسیت جیسے موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔انہوں نے اپنے عمیق مشاہدے کی بنا پر نظموں میں خواتین کے مسائل کو اجاگر کیا۔ڈاکٹر اشرف رفیع کے موضوعات تحقیق وتنقید،فن عروض اور لسانیات رہے ہیں۔عموماً ان کی تصانیف کا محور انہیں موضوعات ارد گرد رہا ہے۔سادہ سلیس زبان میں وہ اپنے خیالات کو پیش کرنے کی سعی کرتی ہیں۔ان کی تصانیف حسب ذیل ہیں:

۱۔ نظم طباطبائی شخصیت اور فن،۱۹۷۳ء

۲۔ تخلیص عروض وقوافی،۱۹۸۲ء

۳۔ مقالات طباطبائی،۱۹۸۴ء

۴۔ دکنی مثنویوں کا انتخاب،۱۹۹۰ء

۵۔ تلاش زبان وادب،۱۹۹۹ء

بچوں کے ادب کے لیے تین کتابیں ء''بھوت''،''سوتی کی تلاش''اور''بی اماں''لکھیں۔ان موضوعات سے ہٹ کر اشرف رفیع کے دوشعری مجموعے''عودِغزل''(۱۹۸۳ء)،''پھر سے جینا ہوگا''،(۲۰۰۴ء) میں منظر عام پر آئے اور قارئین نے ان کو بے حد پسند کیا۔یہ کلام اتنا مشہور ہوا کہ آل انڈیا ریڈیو سے کئی بار نشر ہو چکا ہے۔

دکنی ادب کے سلسلے میں اشرف رفیع کی نمایاں خدمات رہیں ہے کیوں کہ ان کی تصانیف''دکنی مثنویوں کا انتخاب''اور''تلاش زبان وادب''دکنی زبان وادب کے سلسلے میں ان کی اہم تصانیف میں ''تلاش زبان وادب''میں لسانیات پر چار مضامین

۱۔ ہندوستان صوتیات

۲۔ اردو زبان کا آغاز

۳۔ مختلف نظریے

۴۔ اردو کا اثر تلگو پر اور دکنی کی لغت شامل ہیں۔

دکنی ادب کے بارے میں اردو غزل،ابتدائی نقوش،دکنی مثنویاں،دکنی قصائد اور دکنی نثر۔آغاز و

ارتقاء پر سیر حاصل مقالے سپرد قلم کئے گئے ہیں۔اس کا ایک اور اہم مقالہ ''لطف النساء امتیاز اردو کی پہلی صاحب دیوان شاعرہ'' جو ماہنامہ سب رس اور مجلّہ عثمانیہ دکنی ادب نمبر میں شائع ہو چکا ہے۔

ماہنامہ سب رس حیدر آباد میں ڈاکٹر اشرف رفیع کے کئی اہم تحقیقی مضامین شائع ہوئے جن میں:

۱۔ خاور نوری۔شخص و شاعر ،نومبر۱۹۹۲ء

۲۔ محمد قطب شاہ اور اس کے کارنامے، جون ۱۹۹۶ء

۳۔ مثنوی قطب مشتری کی چند لسانی اور اسلوبی خصوصیات، جون۲۰۰۲ء

۴۔ شاہ تراب کی غزل ،نومبر۲۰۰۲ء

۵۔ قلی کے کلام کا عروضی مطالعہ،اگست۲۰۰۴ء

۶۔ ادب میں تنقید کے نئے رجحانات ،نومبر۲۰۰۵ء قابل ذکر ہیں۔

اس کے علاوہ اشرف رفیع نے بے شمار مضامین ،تبصرے،انٹرویوز اور پیش لفظ قلم بند کئے ہیں۔

لطف النساء امتیاز کو اردو کی پہلی صاحب دیوان شاعرہ ثابت کرنے میں اشرف رفیع کا اہم حصہ رہا ہے۔ادبی محفلوں ،سمیناروں ،مشاعروں میں اصرف رفیع کو صدارت کے لیے منتخب کیا جاتا ہے۔بحیثیت صدر بھی وہ سمیناروں کے اجلاس کی صدارت کرتی ہیں۔وہ کئی علمی وادبی اداروں سے وابستہ رہیں اور آج بھی ان اداروں کی رہنمائی میں دن رات محنت و مشقت کرتی ہیں۔مثلاً ادارہ ادبیات اردو،ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ،انجمن ترقی اردو حیدر آباد، نظام اردو ٹرسٹ لائبریری ،انجمن ترقی ادب اور انجمن محفل خواتین وغیرہ۔

ڈاکٹر اشرف رفیع کو کئی انعامات و اعزازات سے نوازا گیا ہے۔ان کی تصانیف پر آندھراپردیش اردو اکیڈیمی کے علاوہ یوپی اردو اکیڈیمی نے بھی ایوارڈ عطا کیا ہے۔

ان کی ادبی خدمات پر (امتیاز میر) ایوارڈ سے ۱۹۹۴ء میں نوازا گیا۔آندھراپردیش اردو اکیڈیمی نے ۲۰۰۸ء میں انہیں کارنامہ حیات پر ''ڈاکٹر محی الدین قادری زور ایوارڈ برائے تحقیق و تنقید'' عطا کیا۔ ڈاکٹر اشرف رفیع عمر درازی کے باوجود آج بھی ادبی و شعری سرگرمیوں میں حصہ لیتی ہیں اور صدارت

کے فرائض بھی ادا کرتی ہیں۔

پروفیسر قیوم صادق

قیوم صادق ۶ جون ۱۹۴۰ء کو تعلقہ احمد پور ضلع عثمان آباد کے ایک علمی و ادبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ان کا پورا نام شیخ محمد عبدالقیوم تھا۔ والد کا نام محمد قاسم شاہد تھا۔ قیوم صادق کی ابتدائی تعلیم بیدر اور حیدر آباد میں ہوئی۔ پڑھائی جاری رکھتے ہوئے مرٹھواڑہ یونیورسٹی اورنگ آباد سے اردو میں ایم اے کیا۔ اس کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے پروفیسر آل احمد سرور کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کے لیے مقالہ لکھنے کی تیاری کی۔لیکن چند وجوہات کی بناء پر بمبئی منتقل ہوگئے اور پروفیسر نجیب اشرف ندوی کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کے لیے مقالہ ''بیجاپور کی اردو مثنویاں'' لکھنا شروع کیا۔ نجیب اشرف ندوی کے انتقال کے باعث قیوم صادق نے اپنا مقالہ پروفیسر نظام الدین گوریکر کی نگرانی میں مکمل کر کے انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

پروفیسر قیوم صادق کی شخصیت ہمہ جہت تھی۔ وہ ایک قابل استاد، ادیب، نقاد، محقق ہونے کے علاوہ ماہر دکنیات بھی تھے۔ انہیں اردو کے ساتھ ساتھ فارسی، کنڑا اور انگریزی زبانوں پر دسترس حاصل تھی۔ وہ عمر بھر علم و ادب سے جڑے رہے۔ وہ دکنیات کے محقق کے طور پر اپنی الگ شناخت رکھتے ہیں۔ ۱۹۶۸ء میں ڈاکٹر قیوم صادق کا بحیثیت اردو لکچرر تقرر عمل میں آیا۔ وہ گورنمنٹ کالج ہاسن اور ضلع بیدر میں درس و تدریس میں مشغول رہے۔ ۱۹۸۱ء میں گلبرگہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے بحیثیت لکچرر اردو وابستہ ہوئے۔ ۱۹۹۱ء میں صدر شعبہ اردو بنائے گئے۔ وہ ڈین فیکلٹی آف آرٹس کے معزز عہدے پر بھی فائز ہوئے۔ اکیڈیمک کونسل کے رکن بھی رہے۔ مزید یہ کہ وہ برسوں تک انجمن اساتذہ جامعات ہند کے اگزیکٹیو ممبر رہے۔ ۲۰۰۰ء کے قریب وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے۔ ان کی تصانیف میں اردو ادب میں تنقید کی اہمیت (۱۹۶۶ء)، اردو زبان کا مذہبی ورثہ (۱۹۶۸ء)، دکنی ادب (۱۹۸۸ء)، بیجاپور کی اردو مثنویاں ۱۴۵۰ تا ۱۷۰۰ء، دکنی غالب ملا وجہی اور دکن زندہ کردم ہیں۔

ان تصانیف کے علاوہ انہوں نے ۱۹۶۹ء میں غالب صدی تقاریب کے سلسلے میں مہارانی کالج میسور سے ''الماس'' کا غالب نمبر نکالا۔۱۹۷۳ء میں بزم ملت ہاسن سے ''شعلہ ادب'' اور دکنی غالب ملا وجہی کے عنوان سے دو مجلّے شائع کیے۔۱۹۹۳ء میں گلبرگہ یونیورسٹی سے ''نوائے گلبرگہ'' سالنامے کی اشاعت شروع کی۔۱۹۹۵ء کا سالنامہ حضرت خواجہ بندہ نوازؒ خاص نمبر نکالا۔۲۸۴ صفحات پر مشتمل اس مجلّہ میں عہد بہمنی کی تاریخ اور حضرات خواجہ بندہ نوازؒ کی تعلیمات و خدمات کا احاطہ کیا گیا۔''نوائے گلبرگہ'' سالنامے کا ایک خاص نمبر قدیم و جدید ادب پر بھی نکالا گیا۔

پروفیسر قیوم صادق کی تصنیفات پر اتر پردیش اردو اکادمی اور کرناٹک اردو اکیڈیمی نے ایوارڈ عطا کیے۔وہ شاگردوں کی ذہنی تربیت اور کردار سازی کے علاوہ ان میں فکر و آگہی کا شعور پیدا کرنے کے لیے کوشاں رہے۔ان کی زیرنگرانی اسکالرز نے پی ایچ ڈی اور ۱۶ طلبہ نے ایم فل کی ڈگریاں حاصل کیں۔ ان کے شاگردوں میں ڈاکٹر طیب انصاری، ڈاکٹر حشمت علی اور ڈاکٹر عبدالباری صدر شعبہ اردو، عربی پونا کالج قابل ذکر ہیں۔اردو ادب کی بے لوث خدمت کرتے ہوئے قیوم صادق نے ۱۶/ مارچ ۲۰۰۸ء کو گلبرگہ میں رحلت پائی۔

ڈاکٹر عقیل ہاشمی

ڈاکٹر عقیل ہاشمی کا اصلی نام سید حفیظ الدین حسین ہے۔ وہ ۱۰/مئی ۱۹۴۰ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔والد کا نام سید بہاء الدین حسین تھا۔۱۹۷۵ء میں عقیل ہاشمی نے ایم اے اردو کی ڈگری حاصل کی۔انہوں نے پی ایچ ڈی کا مقالہ بہ عنوان ''مثنوی دیپک پتنگ کی تنقیدی تدوین'' پروفیسر غلام عمر خاں کی زیرنگرانی میں ۱۹۸۰ء میں ڈگری حاصل کی۔۱۹۸۲ء میں شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ سے بحیثیت لکچرر وابستہ ہوئے۔اسی دوران پوسٹ گراجویٹ ڈپلومہ ان پلیوگرافی (مخطوطہ شناسی) حاصل کیا۔۱۹۸۷ء میں وہ ریڈر بنائے گئے۔۱۹۹۵ء میں پروفیسر کا عہدہ دیا گیا۔۱۹۹۵ء سے ۱۹۹۹ء تک چیرمین بورڈ آف اسٹیڈیز رہے۔ یو جی سی، چیرمین کامن کور کمیٹی بھی رہے۔ ۱۹۹۸ء سے ۲۰۰۰ء تک وہ عثمانیہ یونیورسٹی کے صدر

شعبہ اردو کے معزز عہدے پر فائز رہے اور مئی ۲۰۰۰ء میں وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے۔ کچھ مدت تک ادارۂ ادبیات اردو کے شعبہ امتحانات کے معتمد بھی رہے۔

ڈاکٹر عقیل ہاشمی کو نظم ونثر دونوں پر کافی عبور حاصل ہے۔ وہ ایک اعلی پایہ استاد، ادیب، منفرد شاعر، محقق، نقاد اور مصلح ہونے کے علاوہ ایک وسیع المطالعہ، اعلی اخلاق اور با کردار انسان ہیں۔ ان کی نظم ونثر کی اب تک ۲۰ سے زائد کتابیں شائع ہوچکی ہیں اور مقبول عام بھی ہیں۔ ان کی تصانیف یوں ہیں مثلاً ''موج نظر (۱۹۷۶ء)، ظہور قدسی ۱۹۷۷ء، پہلی خطا ۱۹۷۹ء، حضرت افتخار الدین وطن حیات اور کارنامے ۱۹۸۱ء، فرازنو (شعری انتخاب) ۱۹۸۶ء، آیات پیغمبر نور اللہ (مسلسل اردو نظم) ۱۹۸۹ء، کلیات ایجاد (تنقیدی تدوین) ۱۹۸۹ء، پیغمبران حق ۱۹۸۹ء، مصباح تصوف (تحقیقی تدوین) ۱۹۹۳ء، بیاض نور (نعتیہ انتخاب) ۱۹۹۵ء، کلام سعید جلالی (مرتبہ) ۱۹۹۷ء، حرف وصوت (شعری انتخاب) ۱۹۹۹ء، صبح روشن (مرتبہ) ۱۹۹۹ء، دکنی مناقب کا انتخاب (تنقیدی تدوین) ۲۰۰۰ء، کلام جوہر (مرتب بہ اشتراک محبوب علی خاں اخگر)، دکنی ادب (مرتب برائے ایم اے فاصلاتی تعلیم)، کلید مغفرت (نعتیہ کلام) ۲۰۰۶ء، متاع اقبال (مضامین) ۲۰۰۹ء، ہندوستانی تہذیب اور اردو زبان ۲۰۱۰ء۔

ان کتابوں میں سے آٹھ کتابوں پر آندھرا پردیش اردو اکادمی اور اتر پردیش اردو اکادمی سے ایوارڈ بھی حاصل ہوئے۔ وہ ایک شریف النفس انسان ہیں۔ ہمدرد استاد ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین مقرر بھی ہیں۔ ان کی نگرانی میں دکنی اور دیگر اہم موضوعات پر چھ (۶) اسکالرز نے پی ایچ ڈی اور دس (۱۰) طلبہ نے ایم فل کی ڈگریاں حاصل کیں۔ ان کے شاگردوں میں ڈاکٹر بدر سلطانہ، ڈاکٹر محمد قطب الدین فاروقی، ڈاکٹر محمد عبدالقدیر مقدر، ڈاکٹر نصرت پروین اور ڈاکٹر ہاجرہ کوثر قابل ذکر ہیں۔ جن انعامات و اعزازات سے انہیں نوازا گیا ان میں کچھ خاص اس طرح ہیں:

۱۔ حیدرآباد سے، دبیر ملت

۲۔ لکھنو سے، میر ایوارڈ، ۱۹۹۸ء

۳۔ غالب کلچرل اکیڈمی بنگلور سے، غالب ایوارڈ، ۱۹۹۹ء

۴۔ اے پی اردو اکیڈیمی سے، بسٹ ٹیچر ایوارڈ، ۲۰۰۰ء

۵۔ حیدرآباد سے، مجموعی خدمات کے صلہ میں اعزاز، ۲۰۰۳ء

حیدرآباد کے رسائل و جرائد اور اخبارات میں ان کی نظمیں و غزلیں شائع ہوتی رہتی ہیں۔

پروفیسر یوسف سرمست نے جن سینئر اساتذہ کے ساتھ بھی کام کیا ہے ان میں سرفہرست ڈاکٹر عبدالقادر سروری، ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ اور ڈاکٹر سید سلیمان ندوی کے نام اہمیت رکھتے ہیں جنہوں نے تحقیقی وتنقیدی میدان میں اپنی قابلیت کے جوہر دکھائے ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سارے نام بھی ہیں جن سے مل کر یوسف سرمست نے کام کیا ہے۔ جن میں ڈاکٹر صادق نقوی، وحید اختر، ڈاکٹر طیب انصاری کے نام اہمیت رکھتے ہیں۔

باب سوم

پروفیسر یوسف سرمست کی تنقید نگاری

(الف) نظریاتی تنقید

(ب) عملی تنقید

پروفیسر یوسف سرمست کی تنقید نگاری

(الف) نظریاتی تنقید

یوسف سرمست حیدرآباد میں اپنی تنقید نگاری کی وجہ سے شہرت رکھتے ہیں۔ نہ صرف حیدرآباد کے ادبی حلقوں میں وہ اپنی تحقیقی وتنقیدی صلاحیتوں کی وجہ سے جانے جاتے ہیں بلکہ ہندوستان بھر میں ان کی تنقید نگاری کو خاص مرتبہ حاصل ہے۔ ان کی نظری اور عملی تنقید کے نمونے ان کی تصانیف میں ملتے ہیں۔ ان کی تنقیدی تصانیف میں ''عرفان نظر''، ''بیسویں صدی میں اردو ناول''، ''ادب۔ نقد حیات''، ''ادب کی ماہیئت''، ''منصب اور تعریف''، ''نظری اور عملی تنقید''، ''پریم چند کی ناول نگاری''، ''تحقیق وتنقید'' اور ''اردو افسانہ نگاری میں کرشن چندر کی انفرادیت'' قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے اپنی ان تصانیف میں نہ صرف شعروادب پر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے بلکہ اصناف ادب، شعراء، ادیبوں اور ناقدین ادب پر عملی تنقید کر کے اپنے نظریہ کی وضاحت بھی کی ہے۔ انھوں نے اپنی نظری تنقید میں ادب اور ادبی زبان کیسی ہونی چاہیئے اس پر اظہار خیال کیا ہے۔ ان کے مطابق ادب میں زبان ایسی استعمال کی جاتی ہے جو بہ یک وقت کسی بات کو ظاہر بھی کرتی ہے اور چھپاتی بھی ہے کیوں کہ زبان اور خاص طور پر ادبی زبان استعاراتی ہوتی ہے۔ ادبی زبان میں جذبات واحساسات کو متاثر کرنے کی صلاحیت اور قوت ہوتی ہے۔ اسی لئے یوسف سرمست یہ سمجھتے ہیں کہ ادیب کو تشبیہات، استعاروں اور علامتوں سے کام لینا ضروری ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اپنے انہیں خیالات کو پیش کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں:

''اپنے تاثر کو پوری شدت وقوت سے دوسرے تک پہنچانا ہی

ادیب، شاعر یا فنکار کا کام ہے۔ انسان کے تاثرات جذبات، احساسات متنوع اور رنگا رنگ ہوتے ہیں۔ کسی جذبے، خیال، احساس کا تاثر کو دوسرے تک پہنچانے کیلئے ادیب کو تشبیہات، استعاروں اور رموز و علائم سے کام لینا ضروری ہوتا ہے۔ وہ جب تک ایسا نہیں کرتا اس کے کلام میں اثر پیدا نہیں ہوتا۔ نہ وہ اپنی دلی حالت و کیفیت کو ظاہر کرسکتا ہے۔ اسی وجہ سے شاعر اور ادیب اندرونی اور داخلی کیفیت یا حالت کے اظہار کیلئے کسی بیرونی اور خارجی چیز کی صورتحال کو بیان کرتے ہیں تا کہ اندرونی یا داخلی کیفیت کا اندازہ ہو سکے۔''[1]

شبلی نے ادب میں تخیل کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے۔ اسی طرح یوسف سرمست بھی ادب میں تخیل کی کارفرمائی کے قائل نظر آتے ہیں ان کے مطابق انسان کی باطنی زندگی یعنی اس کے جذبات واحساسات کی پیش کشی کیلئے فنکار کو تخیل سے کام لینا پڑتا ہے۔ تخیل ادبی تخلیقات کی ماہیت میں داخل ہے۔ اس لئے وہ سمجھتے ہیں کہ تخیل کی لہر کی علم وفن میں ضرورت ہوتی ہے۔ ادب اپنی زبان، جذبات انگیزی، تخیل اور افسانویت کی وجہ سے پہچانا جاتا ہے۔ ادب میں تخیل کی اہمیت بتاتے ہوئے پروفیسر یوسف سرمست لکھتے ہیں:

''شعر و ادب کی ابتداء ہی تخیل سے ہوتی ہے اسی وجہ سے جب انسان نے بھاپ اور بجلی کی قوت بھی دریافت نہیں کی تھی اس وقت بھی ادیب اور شاعر آسمان میں پرواز کرتے تھے۔ ادیبوں اور شاعروں نے اپنے تخیل کے زور سے اُڑنے والے قالین، کل کے گھوڑے، اُڑن کھٹولے اور ایسے عصا بنا لئے تھے جن کے ذریعہ

---

[1] ڈاکٹر یوسف سرمست، نظری اور عملی تنقید، دسمبر ۲۰۰۲ء، ص ۲۔۳

انسان اُڑ سکتا تھا اور ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ سکتا تھا۔ تخیل ہی کی وجہ سے حقیقت افسانہ اور افسانہ حقیقت بن جاتی ہے چوں کہ فنکار تخیل سے کام لیتا ہے اس لئے اس کی تخلیق کردہ ہر چیز میں افسانویت داخل ہو جاتی ہے۔'' [1]

اسی لئے تخیل کے ساتھ ساتھ وہ جذبات واحساسات کی پیش کشی کو ضروری خیال کرتے ہیں اور جذبات ہی کے فنکارانہ اظہار کو وہ ادب تصور کرتے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں:

''یہ انسانی جذبات و احساسات کو پیش کرتا ہے۔ جب ہم ان جذبات واحساسات کو فن کے سانچے میں ڈھلا ہوا دیکھتے ہیں تو ہم ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اصل میں انسانی جذبات و احساسات کے فنکارانہ اظہار کا نام ادب ہے۔ اس لئے ادب کی ایک بنیادی شرط یہ بھی ہے کہ وہ اس میں جذبات انگیزی کی قوت ہو۔'' [2]

ادب کے لئے یوسف سرمست اپنے تاثرات کو شدت جذبات اور پوری قوت سے پہنچانے کو ضروری خیال کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ادب میں دلی حالت و کیفیت کے بیان کے لئے فنکار شاعر یا ادب کے لئے تاثرات کے اظہار کو لازمی سمجھتے ہیں تا کہ شاعر کی دلی کیفیت کا اندازہ ہو سکے۔ شعر وادب کی ابتداء تخیل سے ہوتی ہے۔ جب کہ دوسرے علوم کی انتہا تخیل ہوتا ہے۔ تخیل ایک اختراعی قوت ہے۔ یہ دو مختلف چیزوں کو ملا کر ایک نئی چیز پیدا کرتی ہے۔ تخیل کے بغیر ادب میں کوئی چیز ممکن نہیں۔ ادب کے مطالعے میں یوسف سرمست نے جہاں تخیل اور جذبات واحساسات کی ضرورت پر زور دیا ہے وہیں ادب کا تعلق انسانی زندگی سے جوڑتے نظر آتے ہیں اس لئے وہ کہتے ہیں کہ انسان کی زندگی کیلئے ادب ایک

---

[1] ڈاکٹر یوسف سرمست، نظری اور عملی تنقید، دسمبر ۲۰۰۲ء ص ۹

[2] ڈاکٹر یوسف سرمست، نظری اور عملی تنقید، دسمبر ۲۰۰۲ء ص ۷

لازمی جُز ہے۔ کیوں کہ ادب انسان کی زندگی کیلئے اصول متعین کرتا ہے اور تنقید کرتا ہے ان کے مطابق ادب اور نقدِ حیات دونوں مماثلت زندگی سے ہے اور زندگی کی عکاسی و زندگی کی تعبیر اس کی عین صورت ہے۔ چنانچہ پروفیسر یوسف سرمست ''نقدِ حیات'' کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ادب زندگی کا ایک مظہر ہے۔ اس لئے ادب کا تعلق زندگی سے ہر حال میں بہر صورت اٹوٹ رہتا ہے۔ ادب کسی نہ کسی انداز کی تنقید کرتا ہے۔ زندگی کی تحسین، زندگی کی عکاسی، زندگی کی تعبیر حد یہ کہ زندگی سے فرار یہ تمام باتیں ''نقدِ حیات'' ہی میں شامل رہتی ہیں، ادب برائے ادب ہو یا ادب برائے زندگی دونوں ہی ''برائے زندگی'' وجود میں آتے ہیں یہ دونوں نقاطِ نظر ایک حد تک صحیح ہیں لیکن اپنی انتہائی صورت میں دونوں ہی غلط ہوجاتے ہیں یہ اختلاف شاید اس وقت پیدا ہوتا ہے جب ہم ادب اور زندگی دونوں کی گیرائی اور گہرائی پر یقین نہیں رکھتے ہیں۔''[1]

جس طرح زندگی کا تعلق اخلاقی قدروں سے ہے اسی طرح یوسف سرمست کے مطابق ادب کا تعلق بھی اخلاقی قدروں سے ہے۔ باوجود اس کے ادب میں اخلاقی قدروں کا خیال نہیں رکھا جاتا ہے۔ چنانچہ انھیں شکایت ہے کہ دنیائی اعظم ترین میں اس کا خیال نہیں رکھا گیا کہ تخلیقات میں بھی ادب کا تعلق اخلاق سے جوڑا جائے، اپنے ان خیالات کو پیش کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''دنیا کی عظیم شاعری اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ اعلیٰ ترین شعری تخلیقات یا نثری تخلیقات کا اخلاقی قدروں سے تعلق رہا ہے۔ دنیا کے عظیم شعر و ادب میں ایسی مثال ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملیں گی کہ وہ اخلاقی قدروں سے بالکل عاری ہوں اور اس کے باوجود

---

[1] ڈاکٹر یوسف سرمست، ادب۔ نقدِ حیات، ۱۹۹۳ء ص ز

اعظم ترین اوراعلیٰ ترین ادب میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ دنیا کی عظیم ترین تخلیقات میں ایسی کوئی بھی مثال نہیں ملتی جس سے ثابت ہو کہ ادب کا تعلق اخلاق سے گہرااوراٹوٹ ہے۔'' [1]

یوسف سرمست کے مطابق زندگی کی نمائندگی ادب کرتا ہے چوں کہ زندگی کا تعلق اخلاق سے ہے اس لئے ان کے مطابق ادب میں اخلاقی قدروں کی شمولیت ضروری ہے اور چوں کہ ہم انسان ہیں چرند اور پرند سے نہیں ہیں اس لئے یوسف سرمست ادب کا تعلق اخلاق سے جوڑنے کو ضروری خیال کرتے ہیں:

''ادب چوں کہ زندگی کا حصہ ہے اس لئے ادب کو اخلاق سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ اخلاق ہی کی وجہ سے زندگی مہذب بنتی ہے۔ جب پوری تہذیب اخلاق کی پروردہ ہے تو ادب اخلاق کا پروردہ ہے۔ اخلاق اپنے وسیع ترین معنوں میں ادب کی رگ وپے میں سمایا ہوتا ہے۔ اخلاق سے الگ چرندے اور درندے ہوسکتے ہیں انسان نہیں۔ اسی لئے ادب، انسان کے سوا کوئی دوسری مخلوق پیدا نہیں کرسکتی۔'' [2]

زبان کو پہلے فطری عمل سمجھا جاتا ہے لیکن سوسیور نے اس کے برخلاف زبان کے تعلق سے یہ انقلابی تصور پیش کیا کہ زبان علامتوں کا ایک خود ساختہ نظام ہے۔ ہر چیز کیلئے ہر بات کیلئے ایک لفظ دوسرے الفاظ میں ایک صوتی علامت مقرر کرلی گئی ہے۔ یوسف سرمست کے مطابق یہ علامتیں خود بذات کوئی وجود نہیں رکھتی بلکہ زبان کی مجموعی بناوٹ ہی میں اس کی اہمیت ہوتی ہے۔ چنانچہ لسانی علامتوں کا لسانی نظام سے کیا رشتہ ہے اس پر بحث کرتے ہوئے وہ لسانی ساختیات کی تعریف یوں پیش کرتے ہیں:

---

[1] ڈاکٹر یوسف سرمست، نظری اور عملی تنقید، دسمبر ۲۰۰۲ء، ص ۳۵۔۳۶

[2] ڈاکٹر یوسف سرمست، نظری اور عملی تنقید، دسمبر ۲۰۰۲ء، ص۔۳۴

> ''زبان علامتوں کا نظام ہے۔ علامتیں بذات خود کچھ نہیں ہوتیں، زبان کی مجموعی بناوٹ یا ساخت ہی میں وہ اپنی اہمیت اور امتیاز حاصل کرتی ہیں۔ لسانی علامتوں کا مجموعی لسانی نظام سے جو رشتہ اور ربط ہوتا ہے اس کے مطالعے ہی کو لسانی ساختیات کہا جاتا ہے۔'' [1]

بلاغت کے لغوی معنی ''تیز زبانی'' کے ہیں۔ دراصل اس کا مفہوم یہ ہے کہ کلام دوسروں تک ''مرتبہ کمال'' کے ساتھ پہنچ جائے۔ بلاغت کے لئے کن شرائط کا ہونا ضروری ہے اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے یوسف سرمست لکھتے ہیں:

> ''فکر کی بلندی بلاغت کیلئے سب سے اہم شرط ہے۔ بلاغت ایک عظیم روحانی قوت کی آواز بازگشت ہے اسی لئے اکثر اوقات تصنع سے عاری خیالات بھی ہمیں متاثر کئے بغیر نہیں رہتے کیوں کہ ان کے پس پشت مصنف کی روحانی عظمت موجود ہے۔ ہمیں اعلیٰ خیالات اور بلند پایہ اظہار بیان ان مشاہیر کے یہاں مل سکتے ہیں جن کے پاس گہرائی اور سنجیدگی ہے۔'' [2]

یوسف سرمست نے ساختیات پر بحث کرتے وقت استعارہ پر بھی بحث کی ہے۔ انھوں نے استعارہ کے لغوی معنی بتاتے ہوئے کہا کہ استعارہ کے لغوی معنی ہیں ''مانگنا، اُدھار لینا، مستعار لینا'' وغیرہ۔ علم بیان کی اصطلاح میں استعارہ سے مراد حقیقی اور مجازی معنی کے مابین تشبیہ کا علاقہ پیدا کرنا ہے۔ آگے انھوں نے اس کی اصطلاح پر بھی بحث کی ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ استعارہ میں امیج کی اصطلاح کس طرح آتی ہے۔ مختلف مغربی ناقدین کے حوالے پیش کرتے ہوئے وہ استعارہ پر بحث کرتے ہیں:

---

[1] ڈاکٹر یوسف سرمست، نظری اور عملی تنقید، ڈسمبر ۲۰۰۲ء، ص۔ ۲۷

[2] ڈاکٹر یوسف سرمست، ادب کی ماہیت، منصب اور تعریف، ۱۹۳۸ء، ص۔ ۵۱

”جب ساری زبان میں استعارہ ٹھہرتی ہے تو ظاہر ہے کہ اس کی ہر اصطلاح بھی استعارہ ہوگی۔ مراد یہ ہے کہ استعارے، پیکر، اسطورہ اور تمثیل میں گہرا ربط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مُڈمٹن مرے تشبیہ اور استعارے دونوں کے لئے Image یا پیکر ایسی اصطلاح ہے جس میں مذکورہ بالا دونوں اصطلاحیں شامل ہو جاتی ہیں۔ ویلک خود یہ سوالکرتا ہے کہ کیا رمز کسی اہم مفہوم میں ”پیکر اور استعارہ“ سے مختلف ہوتا ہے۔ پھر جواب دیتا ہے کہ ہمارے خیال میں رمز تواتر اور استقلال ہے۔“[1]

رمزیت کی بحث کے سلسلے میں استعارے، تمثیل، پیکر اور اسطورہ کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ بعض وقت ان کو ایک دوسرے سے قطعی مختلف سمجھ لیا جاتا ہے۔ حالانکہ ان میں نہ صرف مماثلت ہے بلکہ معنویت کے دائرے بعض جگہ ایک دوسرے سے اتنے مل جاتے ہیں کہ ان میں حد فاصل قائم کرنا مشکل ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ استعارے، تمثیل اور پیکر و اسطورہ پر بحث کرتے ہوئے یوسف سرمست یوں لکھتے ہیں:

”بعض سمجھتے ہیں کہ رمز میں استعارہ نہیں ہوتا یا تمثیل اور استعارے کے دائرے بالکل مختلف ہیں۔ پیکر کو استعارے سے کوئی علاقہ نہیں۔ اسطورہ یعنی Myth استعارے سے بالکل مختلف کوئی چیز نہیں ہے۔ حالانکہ ان سب میں استعارے ہی کی الگ اور مختلف شکلیں ملتی ہیں۔ اسی وجہ سے رینے ویلک کا کہنا ہے کہ یہ اصطلاحیں ایک دوسرے کے علاقہ میں داخل ہوتی ہیں اور ان کی دلچسپی کا دائرہ بھی ایک ہے۔ اس بات کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ بذات خود زبان

---

[1] ڈاکٹر یوسف سرمست، ادب۔نقد حیات، ۱۹۹۳ء ص۔۱۵۲

بھی استعارہ ہے۔'' [1]

غرض ساختیاتی مطالعے کی بحث کرتے ہوئے انھوں نے ادبی زبان، اس کی لسانی خصوصیات فصاحت و بلاغت کی خصوصیات کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ یوسف سرمست کے مطالعوں میں بنیادی اہمیت زبان کی ہوتی ہے۔ اس لئے وہ اکثر ادب کے جمالیاتی پہلوؤں پر زیادہ نگاہ رکھتے ہیں۔ انھوں نے تاثراتی نظریہ تنقید پر بھی اظہارِ خیال کیا ہے۔ ان کے مطابق تاثراتی تنقید کا غلبہ اردو تنقید پر روز اول سے رہا ہے۔ تاثراتی تنقید ادب کا صرف ایک رُخ سے مطالعہ کرتی ہے اور فقط یہ دیکھتی ہے کہ کسی فن پارے سے ذہن پر کیا تاثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اگر خوشگوار اثر پڑتا ہے تو یقیناً وہ فن قدر ہے۔ چنانچہ تاثراتی تنقید میں جن تین چیزوں کی نشاندہی کی جاسکتی ہے اس کی وضاحت کرتے ہوئے یوں لکھتے ہیں:

''(۱) نقاد کے لئے سب سے ضروری اور اہم بات خود اس کا تاثر اور احساس کا ہے۔

(۲) تاثراتی تنقید میں ایک دوسرا رجحان یہ ملتا ہے کہ ایک فنکار ہی ایک مکمل نقاد ہوسکتا ہے۔ ایک ایسا شخص جو تخلیق کے مرحلے سے نہیں گزرا ہے وہ تخلیق کی نزاکتوں کو کیا جان سکتا ہے۔

(۳) تاثراتی تنقید کا ایک اور رجحان اس کے برخلاف یہ ملتا ہے کہ ایک اچھا نقاد اپنی تنقید ہی کی وجہ سے سچا فنکار ثابت ہوتا ہے۔ تاثراتی تنقید کا ایک انتہا پسندانہ رجحان ہے۔ ایک دلچسپ بات کہ یہ رجحان ادب برائے ادب کے نظریہ کا منطقی نتیجہ ہے۔'' [2]

سارے علوم کی ترقی تحقیق کی رہین منت ہے۔ انسان نے آج جتنی بھی ترقی کی ہے وہ تحقیق کی بدولت ہے۔ تحقیق کی ابتداء کسی مسئلے سے ہوتی ہے۔ پھر مواد جمع کیا جاتا ہے اس کے بعد تجزیہ کیا جاتا

---

[1] ڈاکٹر یوسف سرمست، ادب۔ نقد حیات، ۱۹۹۳ء ص۔ ۱۵۱

[2] ڈاکٹر یوسف سرمست، ادب کی ماہیت، منصب اور تعریف، ۱۹۸۳ء، ص ۱۰۸۔۱۰۹

ہے۔پھر نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے۔اس طرح مسئلے کا حل نکالا جاتا ہے۔اس میں مفروضہ قائم کیا جاتا ہے۔اسی مفروضے سے کام لیا جاتا ہے۔ یوسف سرمست تحقیق کے لئے کسی مفروضے کا ہونا ضروری خیال کرتے ہیں۔اس حوالے سے وضاحت کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

موضوع کا تعین ہونے کے بعد کسی مفروضے یاHypotheses قائم کرنے کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔بعض محققین کے نزدیک ادبی تحقیق میں مفروضے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ بات صحیح نہیں ہے۔ ہر تحقیق کے سلسلے میں ہم شعوری یا غیر شعوری طور پر کوئی مفروضہ قائم کر کے ہی تحقیق کی اگلی منزل طئے کرتے ہیں۔ کچھ اور نہیں تو یہی مفروضہ پیش نظر ہوتا ہے کہ اردو پر اس موضوع پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔اس مفروضے کو سامنے رکھ کر جب مطالعہ کیا جاتا ہے تو بعض وقت یہ انکشاف ہوتا ہے کہ یہ اس موضوع پر کام کرنا غیر ضروری ہے۔ایسی صورت میں موضوع بدلنا ہوگا۔'' [۱]

تحقیق اور تنقید کا آپس میں گہرا رشتہ ہے۔حقیقت کو معلوم کرنا حق کو جاننا اور سچائی تک پہنچنا، تحقیق ہے۔تنقید کا کام پرکھنا، فرق کرنا، جانچنا اور کھرے کھوٹے میں فرق کرنا ہے۔ یوسف سرمست نے تحقیق اور تنقید میں معنوی اعتبار سے مماثلت بتاتے ہوئے دونوں کے درمیانی رشتے پر یوں روشنی ڈالی ہے:

تحقیق اور تنقید ایک دوسرے کیلئے لازم وملزوم ہیں۔ یہ الفاظ معنوی اعتبار سے ایک دوسرے سے اتنے ہی قریب ہیں جتنے عملی طور پر ہیں۔تحقیق کے معنی سچائی اور حقیقت تک پہنچنا ہے۔ لفظ نقد سے مشتق ہے۔نقد عام طور پر سکے یا Cash کیلئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ایران میں ٹکسال میں سکوں کو پرکھا جاتا ہے۔تاکہ اصلی اور نقلی

---

[۱] ڈاکٹر یوسف سرمست، تحقیق وتنقید، ۱۹۹۹ء ،ص۔۴۶

سکوں میں فرق کیا جا سکے۔'' [1]

تخلیق کے لئے تنقید کو ضروری خیال کیا جاتا ہے کیوں کہ کسی فن پارے کا وجود میں آنا ہی تحقیق کی دین ہوتی ہے۔اس کے بعد اس پر اعتراضات اور سوالات اُبھرتے ہیں۔اسی عمل کو تنقید کا نام دیا گیا ہے۔اس طرح تخلیق اور تنقید میں رشتہ قائم ہوتا ہے۔اسی رشتے پر بحث کرتے ہوئے پروفیسر یوسف سرمست لکھتے ہیں کہ:

''تنقید کا تخلیق سے جس درجہ گہرا اور مضبوط رشتہ ہے اس کو تخلیق کار معلوم نہیں کیوں فراموش کر دیتے ہیں۔کیونکہ تخلیق،تنقید کے بغیر وجود ہی میں نہیں آتی۔تنقیدی عمل اور نظر سے ہر فنکار کام لینے پر مجبور ہے۔یہ عمل شعوری بھی ہوسکتا ہے اور لاشعوری بھی۔فنکار جب کسی موضوع کا انتخاب کرتا ہے تو اس میں بھی تنقیدی احساس کارفرما ہوتا ہے۔'' [2]

پروفیسر یوسف سرمست کسی بھی رجحان یا تحریک میں در آئی انتہاء پسندی سے اختلاف کرتے ہیں۔انھیں ترقی پسند تحریک اور جدیدیت میں جس انتہا پسندی سے کام لیا گیا ہے اس سے شدید اختلاف ہے کیوں کہ ان کے مطابق اس انتہا پسندی کی وجہ سے ادب کو نقصان پہنچتا ہے۔جدیدت اور عصری تنقید کا تعارف پیش کرتے ہوئے پروفیسر یوسف سرمست لکھتے ہیں کہ:

جب بھی کسی ادبی رجحان یا تحریک میں انتہا پسندی راہ پائی جاتی ہے تو وہ ادب کے ہر شعبہ کو نقصان پہنچاتی ہے۔ترقی پسندی میں بھی ایسی انتہا پسندی سے کام لیا گیا تھا۔اس کی تفصیل بیان کرنا تحصیل حاصل ہے۔ایک طرح سے جدیدیت کا رجحان اسی کا ردعمل تھا۔

---

[1] ڈاکٹر یوسف سرمست،تحقیق وتنقید،۱۹۹۹ء ، ص۔۴۵

[2] ڈاکٹر یوسف سرمست،ادب۔نقد حیات،۱۹۹۳ء ،ص۔۱۷۵

لیکن جدیدیت نے ابتداء ہی سے انتہا پسندی سے کام لیا۔ خاص طور پر اردو ادب کو اس رجحان سے جتنا اور جیسا نقصان پہنچا وہ شاید نا قابل تلافی ہے۔'' [1]

یوسف سرمست کو جدیدیت سے اس لئے بھی زیادہ اختلاف ہے کیوں کہ جدید ناقدین وہ مغربی تنقید کے بعض اثرات کو بنا سوچے سمجھے قبول کر لیتے ہیں۔ حالاں کہ یوسف سرمست اس بات کے قائل ہے کہ مغربی رجحانات سے استفادہ کیا جا سکتا ہے لیکن ہر چیز کو قبول کر لینا ان کے نزدیک صحیح نہیں ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

''جدیدیت کے زیر اثر لکھی جانے والی تنقید کا المیہ یہ ہے کہ وہ ہر چمکتی ہوئی چیز کو سونا سمجھ لیتی ہے۔ یعنی ہر مغربی تنقیدی رجحان کو عطیۂ خداوندی سمجھ کر اس کی ترویج و اشاعت میں پوری قوت و شدت سے لگ جاتی ہے۔ یہاں کہنا یہ نہیں ہے کہ مغربی رجحانات سے استفادہ نہیں کرنا چاہئے۔ اس سے استفادہ ضروری بھی ہے لازمی بھی کیونکہ وہ مغربی ادب ہو مشرقی، ہر زبان و ادب کا اپنے سے مالدار زبان و ادب سے استفادہ کرنا ضروری ہوتا ہے اور ناگزیر بھی یہ ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے اور ہوتا رہے گا۔'' [2]

(ب) عملی تنقید

پروفیسر یوسف نے نظریاتی تنقید کے ساتھ عملی تنقید کے نمونے بھی اپنی تحریروں میں پیش کئے ہیں۔ انھوں نے اپنی عملی تنقید میں اردو کے نامور ادیبوں شاعروں اور محققین و ناقدین وغیرہ کی تصانیف

---

[1] ڈاکٹر یوسف سرمست، ادب۔ نقد حیات، ۱۹۹۳ء، ص۔ ۱۳۸

[2] ڈاکٹر یوسف سرمست، ادب۔ نقد حیات، ۱۹۹۳ء، ص۔ ۱۴۰

اورفن پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔اس کے علاوہ انھوں نے اردو ادب کی مختلف اصناف پر بھی عملی تنقید کی ہے۔ یہاں ان کی عملی تنقید کا مطالعہ پیش کیا جار ہا ہے۔

1 شعراء پر عملی تنقید

یوسف سرمست نے جن شعراپر عملی تنقید کی ہے ان میں مثنوی نگار، غزل گو، نظم نگار، شاعر ہیں۔

1.1۔مثنوی نگار

دکن شروع سے ہی اردو ادب کا مرکز ہے۔اردو زبان وادب نے بھی دکن میں بتدریج منازل طئے کیئے۔شاعری ہو یا نثری غرض دونوں میں یہاں کے قلم کاروں نے اپنے جوہر دکھائے ہیں اور یہ سلسلہ ابھی بھی جاری ہے۔غزل گوئی میں جو مرتبہ دکن کو حاصل ہے وہ ہندوستان کے کسی خطے کو حاصل نہیں ہوا ہے۔مثنوی ہو یا نظم دونوں میں یہاں طبع آزمائی ہوئی ہے۔ یوسف سرمست نے دکن کے شعراء کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے ایک کتاب ''دکنی ادب کی مختصر تاریخ'' کے عنوان سے لکھی ہے جس میں ان کے فن کا تفصیلی تجزیہ کیا ہے اور ان شعراء کی مثنویوں کی خصوصیات کی نشاندہی کی ہے۔انھوں نے ان شعراء کی شاعری کے مجموعی وصف پر اظہار خیال کی نشاندہی کرتے ہوئے بتایا کہ ان لوگوں نے مثنوی کی صنف کو اپنا کر اپنی صلاحیتوں کو منوایا ہے اور اس صنف کو معراجِ کمال تک پہنچایا ہے۔مثلاً وہ لکھتے ہیں:

> دکنی شعراء کی آج جو اہمیت ہے وہ ان کی غزل گوئی کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ ان کی تمام تر شہرت اور عظمت ان کی نظم نگاری یعنی مثنویوں کی وجہ سے ہے۔ان میں نصرتیؔ ، وجہیؔ ،غواصیؔ ، ہاشمیؔ ابن نشاطیؔ ، احمدؔ گجراتی ،سید شاہ اشرف بیابانیؔ ، برہان الدین جانمؔ ،جگت گرو ، ابراہیم عادلؔ شاہ ثانی ،علی عادلؔ شاہ ثانی ،عبدل عشرتیؔ ، مقیمیؔ ، ملک خشنود، صنعتیؔ ، نظامیؔ جیسے جلیل القدر شعراء کے نام ملتے ہیں۔ان شعراء نے مثنوی کے ذریعہ اپنی نظم نگاری کو معراجِ کمال تک پہنچادیا

تھا۔''[1]

1.2 ۔ غزل گوشعراء

اردو شاعری میں ولؔی دکنی کو اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ انھیں اردو شاعری کا بابا آدم بھی کہا گیا ہے۔ ولؔی نے متعدد شعری اصناف میں طبع آزمائی کی لیکن غزل کو خاص طور پر اپنی توجہ کا مرکز بنایا اور اس کے دامن کو وسیع کیا۔ ولؔی کی زبان سادہ اور سہل ہے لیکن اس کی سادگی میں بھی حسن ہے۔

ولؔی کی غزل کا مطالعہ کرتے وقت یوسف سرمست نے ان کی زبان کی خصوصیات پر خصوصی توجہ صرف کی ہے۔ انھوں نے ولؔی کی زبان میں وسعت تنوع کی نشاندہی کی ہے اور بتایا ہے کہ اسی کی وجہ سے اس میں ہر طرح کے موضوعات ادا کرنے کی قدرت حاصل ہوئی ہے۔ انھوں نے ولؔی کی غزل میں اس لچک کی بھی نشاندہی کی ہے جس کی وجہ سے اچھوتی اور نئی تشبیہات، استعارات اور علامات پیدا ہوسکتی ہیں۔ ان کے مطابق ولؔی کے تغزل میں جیسی لچک ملتی ہے وہ اردو کے کسی دوسرے شاعر کے ہاں نہیں ملتی۔ چنانچہ اپنے انہیں خیالات کا اظہار کرتے ہوئے وہ ان کی زبان کی خصوصیات پر یوں روشنی ڈالتے ہیں:

> ''ولؔی کی زبان میں جو وسعت اور تنوع تھا وہ اس لئے اہمیت رکھتا ہے اس کی وجہ سے زبان ہر قسم کے مضامین ادا کرنے کی قدرت حاصل کر لیتی ہے۔ زبان میں جب لوچ اور لچک ہوتی ہے اس میں اچھوتی اور نئی تشبیہات، استعارات اور علامات پیدا ہوسکتی ہیں۔ ولؔی کے تغزل میں جتنی اور جیسی لچک ملتی ہے وہ اردو کے کسی اور شاعر کے ہاں نہیں ملتی۔ ولؔی فارسی اور عربی تلمیحات، استعارات اور علامتوں کے ساتھ ہندوستانی الفاظ، تراکیب اور تلمیحات کو بھی خوبصورتی سے استعمال کرتے ہیں۔''[2]

---

[1] ڈاکٹر یوسف سرمست، دکنی ادب کی مختصر تاریخ، ۲۰۰۶ء، ص۔۲۱

[2] ڈاکٹر یوسف سرمست، ادب میں نوبل انعام ادبی یا سیاسی اور دوسرے مضامین ۲۰۱۰ء، ص۔۱۹

یوسف سرمست نہ صرف ولؔی سے متاثر نظر آتے ہیں بلکہ انھوں نے میرؔ اور مصحفؔی کے فن کا جائزہ بھی لیا ہے۔انھوں نے میرؔ کی غزل پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے اس کے موضوعات میں غم کی نشاندہی کی ہے اور بتایا ہے کہ یہ غم ان کی شاعری کی روح ہے کیوں کہ ان کے مطابق اسی سے جی ہلکا ہوتا ہے چنانچہ میر تقی میرؔ شاعری کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''میرؔ کی شاعری بھی جی کو ہلکا کرنے والی شاعری ہے، غم ان کی شاعری کی روح ہے''

میر تقی میرؔ کی شاعری پر جو اظہار کیا گیا اس میں وہ خاص تاثراتی نقاد نظر آتے ہیں۔ کیوں کہ اکثر شعراء کی شاعری کے مطالعے میں انھوں نے اسلوب کے ساتھ جذبات واحساسات کو بھی اہمیت دی ہے۔ دراصل وہ عملی تنقید میں جمالیاتی اور تاثراتی انداز بھی نظر میں رکھتے ہیں۔اس کا عہد بھی اور اس عہد کے مسائل بھی نگاہ رکھتے ہیں۔مثلاً مصحفؔی کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے وہ اس عہد کی شاعری کا مخصوص مزاج اور زبان کی خصوصیات پر بھرپور روشنی ڈالی ہے اور بتایا کہ مصحفؔی کا رنگ کس طرح دیگر شعراء سے جدا ہے۔مثلاً وہ لکھتے ہیں:

> ''مصحفؔی کی شاعری کا یہی وہ رنگ ہے جہاں لکھنوی رنگ میں دہلوی رنگ کی نمود ملتی ہے۔اس رنگ میں ایک ایسے لئے دیئے رہنے والی فضا ہے جس سے لکھنو کے شاعر قطعاً ناآشنا ہیں۔ مصحفؔی میں ان دونوں رنگوں کا صحیح امتزاج ملتا ہے ۔لیکن کہیں کہیں ''مصحفؔی''، ''بمقتضائے رواج زمانہ'' ابتدال، پھکڑ بازی اور رعایت لفظی کے بھی شکار ہوگئے ہیں۔'' [1]

یوسف سرمست کی عملی تنقید کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی تنقید میں شاعر و ادیب کی انفرادیت کو دیکھتے ہیں یعنی کسی شاعر کی شاعری کا خاص وصف کیا ہے جو دوسروں سے جدا ہے۔ چنانچہ

---

[1] ڈاکٹر یوسف سرمست، عرفان نظر، ۱۹۷۷ء، ص ۱۷۔۱۸

انھوں نے مصحفیؔ کے مطالعے میں جس طرح دہلوی اور لکھنوی رنگ کے امتزاج کو تلاش کیا ہے اسی طرح غالبؔ کی شاعری کا مطالعہ کرنے پر بھی انھوں نے غالبؔ کے اسلوب پر نگاہ رکھی ہے اور اس کی انفرادیت ان کی زبان کے اچھوتے پن کو قرار دیا ہے۔ جس کی وجہ سے ان کے مطابق شاعر ایک نئی زبان تخلیق کرتا ہے۔ چنانچہ غالبؔ کی زبان کی اس خصوصیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''دراصل جو عظیم شاعر ہوتا ہے وہ اپنی زبان خود بناتا ہے۔ اس کیلئے خیالات، جذبات اور احساسات ایسے ہوتے ہیں کہ وہ عام زبان میں ادا نہیں ہو سکتے۔ اگر عام زبان میں انہیں ادا کرنے کی کوشش کی جائے تو خیال کی ترسیل نہیں ہوتی ہے۔ اس وجہ سے وہ زبان کی تخلیق خود کرتا ہے۔...... غالبؔ کی انفرادیت اس میں بھی ہے کہ انھوں نے اپنی زبان خود بنائی ہے۔ اسی وجہ سے ان کے زبان و بیان میں ایسا اچھوتا پن ملتا ہے جو کسی اور شاعر کے کلام میں ملنا ناممکن ہے۔ زبان کے اس تخلیقی استعمال کی وجہ سے شاعر مروجہ قواعد زبان کی پابندی نہیں کرتا کیونکہ وہ خود ایک نئی زبان کی تخلیق کرتا ہے۔''[1]

غالبؔ کے مطالعے کے وقت بھی انھوں نے زبان و بیان کے معاملے میں جہاں اس کی انفرادیت پر روشنی ڈالتی ہے وہیں ان کی غزلوں کے موضوعات پر بھی نگاہ رکھی ہے۔ مثلاً غالبؔ کی غزل پر ان کے خاندانی حالات، نسلی اثرات، غالبؔ کی غزل پر ان کے خاندانی حالات، نسلی اثرات، غالبؔ کا مخصوص مزاج، ان کی فکر، اس عہد کی تہذیبی عناصر وغیرہ پر بھی نگاہ رکھی ہے۔ یہ تمام عناصر ایک سائنٹفک نقاد کے یہاں بھی دکھائی دیتے ہیں۔ یوسف سرمست ان کی شخصیت پر ان اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''غالبؔ کی شخصیت کی تعمیر میں نسلی اور خاندانی اثرات سے لے کر

---

[1] ڈاکٹر یوسف سرمست، نظری اور عملی تنقید، دسمبر ۲۰۰۲ء ص ۹۵۔۹۶

اس زمانے کی تہذیب اور اس کی قدریں ایسی جذب تھیں جیسے آئینے میں جوہر۔ غالبؔ کے مزاج میں جہاں ایک قسم کا استغنا تھا، ایک فلسفیانہ بلندی تھی جہاں سے دنیا انھیں ''بازیچۂ اطفال'' نظر آتی تھی، وہیں ''تماشائے گلشن اور تمنائے چیدن'' کا جذبہ بھی پوری شدت سے موجود تھا۔ اس کی وجہ سے ان کی شخصیت کی نیرنگیاں ہیں۔ غالبؔ کی شخصیت میں جو عظمت تھی وہ بھی انھیں منفرد بناتی تھی۔''[1]

غالبؔ کی شاعری میں محبوب کے تصور پر اظہار خیال کرتے وقت بھی یوسف سرمست نے ان عہد کے معاشرے اور ماحول کو پیش نظر رکھا اور بتایا کہ غالبؔ کے یہاں محبوب کا تصور کن حالات اور ماحول کی پیداوار ہے۔ اس عہد کی تہذیبی قدریں کیا تھیں اور محبوب کے حسن کی والہانہ انداز میں تعریف بھی اسی ماحول اور تہذیبی قدروں کے تقاضے کی دین ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''غالبؔ کی اُٹھان جس ماحول میں ہوئی تھی، وہاں حسن پرستی امیرانہ زندگی کا جزو تھی۔ ''معشوقانِ عشق پیشہ''، کو بلوانا یا ان کے مجرے میں شریک ہونا امیرانہ زندگی کی لازمی شرط تھی۔ حسن پرستی کو شعار بنانا بوالہوسی نہیں بلکہ تہذیبی قدروں کا تقاضا تھا۔ غالبؔ حسن کا ریغنی فنکار تھے...... غالبؔ کا عشق ان کی حسن پرستی کا بھی نتیجہ ہے۔ وہ جس والہانہ انداز میں حسن کی تعریف و توصیف کرتے ہیں وہ ان کی عشقیہ شاعری کو ایک ترفع بخشنے کے لئے کافی ہے۔ ان کی حسن پرستی میں خلوص انہماک، آزادی و بے باکی، سادگی اور صفائی ہے۔ حسن جس رنگ میں ہوتا ہے جہاں ہوتا وہ غالبؔ کیلئے ''سرمایہ جاں'' ہوتا

---

[1] ڈاکٹر یوسف سرمست، نظری اور عملی تنقید، دسمبر ۲۰۰۲ء ،ص۔۹۷

ہے۔ ان کو صنف لطیف کے حسن میں ''ہیولی شعلہ طور'' نظر آتا
ہے۔اس لئے وہ محبوب کو''سراپا نور ایزدی'' سمجھتے ہیں۔''[1]

غالبؔ کے علاوہ یوسف سرمست نے غالبؔ کے ہم عصر شاعر مومنؔ کی غزل گوئی کا بھی مطالعہ کیا ہے۔ان کی شاعری کے تجزیئے کے وقت بھی ان کی نظر ان کی انفرادیت کی طرف جاتی ہے۔انھوں نے مومنؔ کی شاعری میں جذبات واحساسات کی شدت کی وجہ سے سوز وگداز کی جو کیفیت پیدا ہوگئی ہے،اس کا اظہار انھوں نے نہایت دلکش انداز میں کیا ہے۔جس سے خود ان کی تخلیقی نثر کا اندازہ ہوتا ہے مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''مومنؔ کی عشقیہ شاعری میں کیفیات حسن اور معاملات عشق کی ترجمانی کو نمایاں اور اہم مقامات حاصل ہے لیکن یہ ترجمانی مومنؔ کے ہاں خیالی یا تصوری نہیں ہوتی۔ بلکہ شاعری کی اس شیشہ گری میں حقیقت اور واقعیت کا زنگار لگا ہوا ہے۔یہی وجہ ہے کہ وہ ایک آئینہ خانہ بن گیا ہے اور اس شیش محل میں ہر ایک کو اپنی شکل نظر آجاتی ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ مومنؔ نے خود عشق کیا تھا اور ساری عمر اسی کوچہ کی خاک چھانتے رہے۔ان کا ایک عشق تو کافی مشہور بھی ہوا جس کی یادگار ان کی مثنوی ''قولِ غمیں'' ہے ......
مومنؔ کی شاعری میں ''نگاہِ یار'' کی ''معجز بیانی'' آ گئی ہے اور ہر ایک کو گمان ہوتا ہے کہ یہ ان کے دل کی بات ہے۔مومنؔ کے پاس گو ایک ابہتاجی کیفیت ہے لیکن اس میں سوز وگداز اور دردمندی بھی پائی جاتی ہے۔نرم آنچ کی ایک لپک ان کے کلام میں کیوں نہ آتی انھوں نے عشق کیا تھا اور اس ''آگ کے دریا'' میں سے ڈوب

---

[1] ڈاکٹر یوسف سرمست ،نظری اور عملی تنقید، دسمبر ۲۰۰۲ء ،ص۔۱۲۱

کر جانا پڑا تھا۔اس لئے مومنؔ کی عشقیہ شاعری ''سوز وساز'' کی
لے پر رقصاں نظر آتی ہے۔''[1]

1.3 ۔نظم نگار

یوسف سرمست نے نہ صرف مثنوی نگار اور غزل گو شعراء کے کلام پر عملی تنقید کی ہے بلکہ نظم گو شعراء کے کلام کا بھی تجزیہ کیا ہے خصوصاً اقبالؔ، مخدومؔ محی الدین اور فیضؔ کے نام اس سلسلے میں اہمیت رکھتے ہیں۔ اقبالؔ اردو نظم گو شعراء میں اہم نام ہے۔اقبالؔ کی شاعری کے مطالعے میں بھی ان کی نظر ان کے اسلوب پر رہتی۔ جہاں وہ اسلوب کی خصوصیات کی نشاندہی کرتے ہیں وہاں ان کا لہجہ تاثراتی ہوتا ہے مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''اقبالؔ کی شاعری کی یہ شعلہ آسامی ایسی ہے کہ اگر کوئی کور چشم اس روشنی سے فائدہ حاصل نہ کرنا چاہئے تو بھی وہ اس کی حد سے اپنے جسم و جان کیلئے گرمی حاصل کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے۔ اس لئے اس بات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ترقی پسند تحریک نے اقبالؔ سے فائدہ حاصل نہیں کیا ہے۔ یا اس کے اثر سے محفوظ رہی ہے۔کیونکہ اقبالؔ، کے پاس رموز و علائم اظہار و ابلاغ کے اسالیب فن کی منزلیں لہجے کے روپ، آہنگ اور لے کی جھنکاریں، داخلی اور خارجی دنیا کی عکاسی، غرض فکر و فن کی اتنی اور ایسی رنگا رنگی، قدرت وجدت اور شستگی اور شائستگی بصیرت اور بصارت ملتی ہے کہ اس سے دامن بچا کے نکل جانا محال ہی نہیں ناممکن ہے۔اسی لئے ترقی پسند تحریک کا کوئی بھی شاطر ہو اور کتنا ہی بڑا شاطر ہو باوجود اپنی

---

[1] ڈاکٹر یوسف سرمست، عرفان نظر، ۱۹۷۷ء، ص ۳۲۔۳۳

عقیدہ پرستی کے اقبالؔ کے فکر و فن کا خوشہ چیں رہا ہے۔'' [1]

یوسف سرمست کی اس رائے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اقبالؔ کی عظمت کے قائل ہیں۔ساتھ ہی اس اعتراض کا جواب دیتے بھی نظر آتے ہیں کہ اقبالؔ پر ترقی پسند تحریک کا اثر رہا ہے۔ان کے مطابق اقبالؔ نے ترقی پسند تحریک کے زیر اثر نہیں لکھا بلکہ ترقی پسندوں نے ضرور ان سے اثرات لیے ہیں۔ چوں کہ اردو شاعری میں اپنے فلسفے کی وجہ سے شہرت رکھتے اس لئے بہت سے ناقدین ان کی شاعری اور فلسفے کے اعتبار سے متضاد رائے رکھتے ہیں کبھی انھیں بڑا شاعر اور چھوٹا مفکر قرار دیا تو کبھی بڑا مفکر اور چھوٹا شاعر اور بڑا مفکر قرار دیا ہے۔جس کی وجہ سے یوسف سرمست اس فیصلے سے اتفاق نہیں کرتے ہیں چنانچہ وہ ان مختلف آراء کی وجوہات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مفکر اقبالؔ کے پرستاروں کی سمجھ میں یہ نہیں آتا ہے کہ وہ شاعر اقبالؔ کا کیا کریں اور شاعر اقبالؔ کے پرستار اس بات پر حیران ہیں کہ وہ مفکر اقبالؔ کے ساتھ کیا سلوک کریں۔'' [2]

ڈاکٹر یوسف سرمست نے اقبال کے فلسفہ خودی کو بنیاد بنا کر ان کے تمام تر فلسفیانہ فکر کا مطالعہ کیا ہے اور اس کا محور بھی اسی خودی کے فلسفے کو قرار دیا ہے۔مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''اقبالؔ کے فلسفہ اور شاعری میں خودی کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ان کے سارے فلسفے و شعر کا محور حقیقی یہی جذبہ خودی ہے''۔[3]

یوسف سرمست نے مخدومؔ محی الدین کی شاعری پر بھی تنقید کی ہے۔مخدومؔ محی الدین ترقی پسند تحریک سے وابستہ شاعر تھے۔انھوں نے اپنی شاعری میں طبقاتی کشمکش کے آلام و مصائب بیان کئے ہیں جس کی وجہ سے انھیں محنت کشوں کا شاعر کہا گیا ہے۔انھوں نے نظم نگاری کے ذریعے ہی اپنی صلاحیتوں کا لوہا

---

[1] ڈاکٹر یوسف سرمست، ادب۔نقد حیات، ۱۹۹۳ء، ص۔۳۴

[2] ڈاکٹر یوسف سرمست، ادب۔نقد حیات، ۱۹۹۳ء، ص۔۴۶

[3] ڈاکٹر یوسف سرمست، عرفان نظر، ۱۹۷۷ء، ص۳۶

منوایا ہے۔ مخدوم محی الدین کی شعری خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر یوسف سرمست لکھتے ہیں کہ:

''مخدومؔ محی الدین محبت کی مختلف کیفیتوں کو جس حسن کارانہ انداز میں بیان کرتے ہیں اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کس طرح کسی ''خوش جمال'' کے خیال سے دل مضطر تڑپنے لگتا ہے اور دیدہ تر برسنے لگتا ہے۔ ایسے میں ''شب تاریک'' کی خاموشی میں ''لطف سجدوں'' میں آتا ہے۔ اور یوں دل میں سما کر کوئی ہستی پر چھا جاتا ہے تو نظم ''سجدہ'' کی تخلیق ہوتی ہے۔ ان کی نظم 'لمحۂ رخصت'' میں بھی کچھ سننے کی خواہش کانوں کو اور کچھ کہنے کا ارمان آنکھوں کو ہوتا ہے۔''[1]

اس اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ یوسف سرمست نے مخدوم کی شاعری کا جس طرح مطالعہ کیا اس میں وہ ان کے انداز بیان کی لطافت کے قائل ہیں۔ وہ ان کی رومانی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے اس میں ان کے دلی جذبات و احساسات کے بہترین اظہار کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں۔ ساتھ ہی انھوں نے مخدومؔ کی رومانی شاعری کے اسلوب کی لطافت پر جس انداز میں روشنی ڈالی وہ خالص تاثراتی ہے۔ یہ یوسف سرمست کی تنقید کا خاص وصف ہے کہ جب وہ کسی شاعر کی زبان کی خوبیوں کا بیان کرتے ہیں تو خود ان کا انداز تاثراتی ہو جاتا ہے اور ان کی تنقید پڑھ کر ہمیں ان کی نثر کی لطافت اور خوبصورتی کا اندازہ ہونے لگتا ہے۔

غرض وہ مخدومؔ کے اسلوب کی انفرادیت ان کے حسن کارانہ اندازِ بیان کو تسلیم کرتے ہوئے ان کی غزلوں میں بھی ایسی ہی خوبی تلاش کی ہے۔ مثلاً غزل کا تغزل مخدومؔ کی غزلوں میں بھی پایا چنانچہ لکھتے ہیں:

''اس میں شک نہیں کہ غزل گوئی میں بھی مخدومؔ نے اپنی انفرادیت

---

[1] ڈاکٹر یوسف سرمست، ادب۔ نقد حیات، ۱۹۹۳ء ،ص۔ ۱۱۵

کو قائم رکھا ہے لیکن جس طرح اردو نظم گوئی کی تاریخ بغیر مخدومؔ کے ذکر کے پوری نہیں ہوسکتی اس طرح ہم ان کی غزل گوئی کے تعلق سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ اردو غزل کی تاریخ ان کے نام کی شمولیت کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔ بہرحال مخدومؔ اردو کے اہم ترین شاعروں میں سے ایک ہیں۔''[1]

یوسف سرمست کا جمالیاتی و تاثراتی انداز فیض کی شاعری کے مطالعے کے وقت بھی نظر آتا ہے۔ مثلاً ان کے کلام میں جو چیز سب سے زیادہ دل و دماغ کو متاثر کرتی ہے وہ اختصار و جامعیت ہے۔ وہ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ مفہوم پیش کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یوسف سرمست نے ان کی شاعری میں جو علامتیں پھول، کانٹے اور آتش وغرور کی استعمال ہوئی ہیں وہ دراصل ان کی ذات کی نشاندہی کرتی ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''فیضؔ کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے پھول کانٹوں میں نظر آرہے ہیں اور کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے ''اُوپر اُوپر پھول کھلے ہیں بھیتر بھیتر آگ'' فیضؔ کی شاعری کی یہ آگ اور پھول خود ان کی ذات کی نشاندہی کرتے ہیں اور یہ بات صاف ظاہر ہوجاتی ہے کہ آتش نمرود کو گلزار بنادینے میں فیضؔ کی شخصیت کام کررہی ہے۔''[2]

فیضؔ ایک ایک لفظ کا انتخاب غور وفکر کے بعد کرتے ہیں۔ شعروں میں تراش خراش کا عمل مسلسل جاری رکھتے ہیں۔ وہ تمام شعری وسائل کا سہارا لیتے ہیں۔ یوسف سرمست کے مطابق وہ استعاراتی و ایمائی انداز بھی اختیار کرتے ہیں اور مخصوص لہجے کی کسک بھی اختیار کرتے ہیں اور جو ملائمت پائی جاتی ہے

---

[1] ڈاکٹر یوسف سرمست، ادب۔ نقدِ حیات، ۱۹۹۳ء، ص۔ ۱۳۷

[2] ڈاکٹر یوسف سرمست، عرفانِ نظر، ۱۹۷۷ء، ص۔ ۴۸

وہ دراصل وہ ان کی شخصیت کی وجہ سے ہے کیوں کہ ان کی شخصیت کی مٹھاس و نرمی ہی نے ان کے جذبات کی آگ کو میٹھی آگ بنا کر پیش کیا ہے جو غزل کی روایت کا بھی حصہ ہے۔ چنانچہ ان کے غزل کے اسلوب کی خصوصیات کی نشاندہی کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''فیضؔ نے غزل کا نہ صرف ایمائی اور استعاری انداز اختیار کیا ہے بلکہ لہجہ کی وہ مخصوص کسک بھی اختیار کی ہے جو جذبات کے تیز و تند شعلہ کو میٹھی آگ بنا کر پیش کرتی ہے۔ تیر نیم کش کی وہ خلش جو دل کو پیکان بنا دیتی ہے انھوں نے غزل کی روایات کو جو اردو شاعری کی بھی روایت ہے، جس تکمیل سے آگے بڑھایا ہے اس سے خود ان کی شاعری عظمت اختیار کر گئی ہے۔''[1]

اردو شعراء پر عملی تنقید کے اس مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یوسف سرمست نے ولیؔ، مصحفیؔ، میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ، مخدومؔ اور فیضؔ تقریباً تمام بڑے شعراء کی شاعری پر اپنی تنقیدی آراء کا اظہار کیا ہے۔ ان کی تنقید میں جہاں وہ شاعر کی شخصیت، خاندان و نسل کے اثرات، ماحول اور معاشرتی حالات پر نگاہ رکھتے ہیں۔ وہیں شاعر کی زبان اور اس کے اسلوب کی انفرادیت پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔ ان مطالعات میں ان کا انداز اکثر جمالیاتی و تاثراتی ہوتی ہے۔ حالاں کہ ان کا انداز لطیف اور خوبصورت ضرور ہوتا ہے لیکن ان کی رائے معتدل نظر آتی ہے کیوں کہ انھوں نے اپنی آراء میں حد سے زیادہ عقیدت مندی کا اظہار بھی نہیں کیا ہے۔ بلکہ نپی تلی رائے دیتے ہوئے شاعر کی انفرادیت پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔

2۔ ادیبوں پر عملی تنقید

پروفیسر یوسف سرمست نے نظریاتی تنقید کے ساتھ عملی تنقید کے نمونے بھی اپنی تحریروں میں پیش کئے ہیں۔ انھوں نے اپنی عملی تنقید میں اردو کے نامور ادیبوں، شاعروں اور محققین و ناقدین وغیرہ کی

---

[1] ڈاکٹر یوسف سرمست، عرفان نظر، ۱۹۷۷ء، ص۔ ۵۹

تصانیف اور فن پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔اس کے علاوہ انھوں نے اردو ادب کی مختلف اصناف پر بھی عملی تنقید کی ہے۔ یہاں ان کی عملی تنقید کا مطالعہ پیش کیا جا رہا ہے۔

2.1۔ناول نگار

یوسف سرمست نے جن ادیبوں پر عملی تنقید کی ہے ان میں ناول نگار، افسانہ نگار، محقق و ناقدین کے نام شامل ہیں۔انھوں نے نذیر احمد کے ناولوں پر خصوصی طور پر عملی تنقید کی ہے۔نذیر احمد اردو کے پہلے ناول نگار تسلیم کئے جاتے ہیں کیوں کہ اردو میں اس صنف کی بنیاد انہی کے ہاتھوں پڑی۔انھوں نے پہلا ناول اپنے بچوں کی تربیت کی غرض سے لکھا تھا۔''مراۃ العروس'' ان کا پہلا ناول ہے جو ۱۸۶۹ء میں لکھا گیا۔نذیر احمد نے اپنے ناولوں کے ذریعہ مغربی تہذیب وتمدن کے خلاف آواز اٹھائی کیوں کہ اس زمانے میں ہندوستان پر انگریزوں کا قبضہ تھا اور انگریزی تہذیب کے اثرات ہمارے سماج اور معاشرے پر پڑ رہے تھے۔یہی وجہ تھی کہ نذیر احمد اپنے ناولوں کے ذریعے مشرقی تہذیب کو پیش کرنے کی کوشش کی۔ یوسف سرمست نے بھی اپنی عملی تنقید میں نذیر احمد کے عہد اور اس کے سماجی وتہذیبی مسائل کی نشاندہی کی ہے۔چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> ''وظیفہ ملتے ہی نذیر احمد کا بڑھتے ہوئے مغربی تمدن کے خلاف آواز اُٹھانا ظاہر کرتا ہے کہ ان کی نگاہ ہمیشہ سماجی زندگی اور سماجی تبدیلی پر کتنی گہری پڑتی تھی۔انھیں اپنی ملازمت کے دوران لازمی طور پر بے شمار انگریزوں، ہندوستانی عہدیداروں سے سابقہ پڑ چکا تھا اور ان کی باریک بین نگاہوں نے دیکھ لیا کہ یہ طبقہ بُری طرح مغرب زدہ ہو گیا ہے اور اپنی زندہ و پائندہ اور جاندار روایات اور طریقہ زندگی کو چھوڑ کر مغربی تمدن وتہذیب کے سیلاب میں اپنے آپ کو بہا دینے میں نجات سمجھ رہا تھا۔'' [۱]

---

۱ پروفیسر یوسف سرمست، عرفان نظر، ۱۹۷۷ء، ص ۶۹

نذیر احمد کے ناولوں میں خصوصاً ناول ''ابن الوقت'' کا تجزیہ کرتے ہوئے انھوں نے اس کے مرکزی کردار کی خصوصیت پر خاص طور پر روشنی ڈالی ہے۔ان کے مطابق یہ کردار مشرقی تہذیب کا پروردہ ہوتے ہوئے بھی مغربی طرز زندگی کو زبردستی اپنے اوپر لانے کی کوشش کرتا ہے جس کی وجہ سے یہ کردار پوری طرح واضح نہ ہوسکا چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''نذیر احمد نے اس ناول میں یہ بھی بتایا ہے کہ انسان جب غیر فطری زندگی گزارنے لگتا ہے تو پھر زندگی اس کے لئے مصیبت بن جاتی ہے۔ کیوں کہ وہ اپنے سماج سے کٹ جاتا ہے۔ ابن الوقت ایسی زندگی بسر کرنے کی کوشش کررہا تھا جس کا وہ فطری عادی نہ تھا۔ ہندوستان یا مشرقی طرز کی زندگی گزارنا اس کی فطرت میں داخل ہوگیا تھا لیکن ''ابن الوقت'' خواہ مخواہ ایک نئی طرز زندگی کو اپنے پر لادرہا تھا۔ ظاہر ہے کہ ''ابن الوقت'' اپنے پر یہ بوجھ غیر ضروری طور پر لادرہا تھا۔اس لئے وہ اس کے تلے دب کررہنے لگا۔'' [1]

یوسف سرمست نے نذیر احمد کے مذہبی لگاؤ اور مشرقی زندگی سے اُنسیت پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ بتایا اور مغربی زندگی کی تقلید کے اثرات پر ابن الوقت کے کردار کے ذریعے کس طرح پیش کیا اس کی یوسف سرمست نے بھرپور طور پر وضاحت کی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''ابن الوقت میں نذیر احمد نے اس بات کو ثابت کیا ہے کہ مغربی تمدن کی پیروی میں غلو کرنے کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان مذہب سے بیگانہ ہونے لگتا ہے۔ انھوں نے اس ناول میں یہ بھی بتانے کی کوشش کی ہے کہ مغربی تمدن کی تقلید سے صرف دین ہی ہاتھ سے نہیں جاتا بلکہ دنیا بھی خراب ہوتی ہے کیونکہ مغربی طرز کی

---

[1] ڈاکٹر یوسف سرمست، عرفان نظر، ۱۹۷۷ء، ص۔۷۲

زندگی بڑی مہنگی ہوتی ہے۔ ہندوستانیوں کیلئے اس مہنگی زندگی کے
اخراجات برداشت کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہوجاتا ہے جس کی
وجہ سے وہ مقروض ہوجاتے ہیں۔ ابن الوقت بھی ایسی زندگی
گزارنے کی کوشش میں مقروض ہوجاتا ہے۔'' ۱؎

یوسف سرمست نے نذیراحمد کے ناول ''ابن الوقت'' کی خوبیوں اور خامیوں دونوں پر روشنی ڈالی ہے۔ اس عہد کے مسائل کو کس طرح نذیراحمد نے عمدگی سے اس ناول میں پیش کیا ہے اس کی ستائش کرتے ہوئے یہ بتایا کہ نذیراحمد ناول کے فن کی لچک اور وسعت کا ادراک رکھتے تھے اس لئے کرداروں پر زیادہ توجہ دی ہے جبکہ کہانی اور پلاٹ پر ان کی توجہ کم رہی جس کی وجہ سے کہانی بہت معمولی ہے۔ چنانچہ ناول ''ابن الوقت'' کی خصوصیت بیان کرتے ہوئے یوسف سرمست لکھتے ہیں:

'''ابن الوقت' کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ انھوں نے
مختلف مسائل جن میں انگریزی اقتدار، معاشی حالات، مغربی تمدن
کی تقلید، انگریزی حکومت کے روشن پہلو شامل ہیں۔ ان سبھی باتوں
کو انھوں نے بڑی عمدگی کے ساتھ بیان کردیا ہے۔ نذیراحمد کے
ناول میں ان سب مسائل کے بیان کرنے اور ان پر بحث کرنے
سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ناول کے فن کی لچک اور وسعت کا خواہ
غیرشعوری طور پر سہی ایک احساس ضرور رکھتے تھے۔ اس لئے انھوں
نے اس ناول میں پلاٹ اور کہانی کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی۔
حالانکہ یہ ناول ۱۹۸۸ء میں لکھا گیا ہے، جب کہ وہ چار ناول لکھ
چکے تھے۔ اس ناول کی کہانی بھی بہت معمولی ہے۔'' ۲؎

۱؎ ڈاکٹر یوسف سرمست، عرفان نظر، ۱۹۷۷ء، ص ۲۷

۲؎ ڈاکٹر یوسف سرمست، نظری اور عملی تنقید، دسمبر ۲۰۰۲ء، ص۔ ۱۸۵

نذیر احمد کے علاوہ انھوں نے سجاد حسین کے ناول ''نشتر'' کا جائزہ لیتے ہوئے اس ناول کی خوبیوں اور خامیوں کا ذکر کرتے ہیں اور اس ماحول کی سچی عکاسی کے پس منظر میں حسن و عشق کے واردات کی جاندار پیش کشی کی۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''پلاٹ میں بعض وقت کچھ جھول سا آ گیا ہے جو کردار کو بعض وقت پوری طرح سمجھنے نہیں دیتا......اس کے باوجود ماحول کی سچی عکاسی کے پس منظر میں حسن و عشق کی وارفتگیوں کی جاندار پیش کشی اور اس کے دوسرے محاسن اس ناول کو اہم بنا دیتے ہیں اور اپنے ان محاسن کی وجہ سے اردو ناول نگاری میں اپنی انفرادیت کو قائم رکھے گا۔''[۱]

انھوں نے آگے اس بات پر روشنی ڈالی ہے کہ سجاد حسین کی ناول نگاری کے ساتھ آج تک انصاف نہیں ہوا ہے جس کے وہ حقدار تھے۔ حالانکہ یہ ناول نگار منشی پریم چند سے بہت پہلے سیاسی ہلچل، معاشی حالات اور قومی تصورات کو اپنے ناول میں جگہ دے چکے ہیں۔ چنانچہ یوسف سرمست نے ان ناولوں کا تفصیل سے جائزہ لے کر ان کی اہمیت و خصوصیات کی بنا پر ادب میں ان کا مقام متعین کیا ہے۔ اس تعلق سے لکھتے ہیں:

جاگیردارانہ اور زمیندارانہ نظام کی خرابیاں معاشی ابتری کی نفسیاتی اثرات ایسے موضوعات ہیں جو سجاد حسین سے پہلے کبھی بھی چھوئے نہ گئے تھے۔ اس لحاظ سے ان کے ناولوں کو بڑی اہمیت حاصل ہو جاتی ہے لیکن اردو کے ناقدین اور مورخین ان کی ناول نگاری میں سوائے مزاح کے کسی اور بات کو نہیں دیکھ سکے حالانکہ وہ بیسویں صدی کی ناول نگاری کا مکمل شعور رکھتے ہیں بلکہ ان کی ناول نگاری اپنے عہد سے ایک اعتبار سے آگے ہے کیوں کہ سیاسی اور سماج کی

۱؎ ڈاکٹر یوسف سرمست، بیسویں صدی میں اردو ناول، تیسرا ایڈیشن ۲۰۱۶ء، ص۔۶۱

معاشی زندگی کو پیش کرنے اور اس کو اہمیت دینے کا رجحان اردو ادب میں بعد میں فروغ پایا۔اس طرح کئی اعتبار سے سجاد حسین کی ناول نگاری اردو ناولوں کی تاریخ میں بڑا امتیازی اور منفرد مقام رکھتی ہے۔'' [1]

یوسف سرمست کا کہنا ہے کہ شرر جن ناولوں میں ایک مخصوص فضا پیدا کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں وہاں ان کی کردار نگاری کامیاب ہوئی ہے۔اس بات کو وہ یوں بیان کرتے ہیں:

''جن ناولوں میں شرر ایک مخصوص فضاء اور ماحول پیدا کرنے میں کامیابی حاصل کرتے ہیں وہاں ان کی کردار نگاری بھی بہت کامیاب ہے۔ کردار نگاری کے اعتبار سے ''فردوس بریں''، ''زوال بغداد'' اور ''بابک خرمی'' سب سے اونچی حیثیت رکھتے ہیں۔'' [2]

شرر کی ناول نگاری کا تفصیل سے جائزہ لیتے ہوئے انھوں نے ان کے معاشرتی اور سماجی ناولوں کے مقابلے میں تاریخی ناولوں کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے اور انھیں ان کی صلاحیتوں کے باوصف کیا کہ وہ اردو کے سر والٹر اسکاٹ کہے جاسکتے ہیں چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

''شرر کے سماجی اور معاشرتی ناول کے مقابلے میں ان کے تاریخی ناول انھیں اردو ناول کی تاریخ میں ایک بلند مقام دیتے ہیں کیوں کہ نہ صرف انھوں نے ناول کو ایک مقصد کیلئے استعمال کرکے اس کی وسعت کو ظاہر کیا بلکہ اس طرح انھوں نے والٹر اسکاٹ کی مانند ناول نگاری کی نئی سمت کو دریافت کیا۔شرر کی بسیار نویسی اور زود

---

[1] ڈاکٹر یوسف سرمست، بیسویں صدی میں اردو ناول، تیسرا ایڈیشن ۲۰۱۶، ص ۶۹۔۷۰

[1] ڈاکٹر یوسف سرمست، بیسویں صدی میں اردو ناول، تیسرا ایڈیشن ۲۰۱۶ء، ص۔۱۱۴

نویسی نے ان کی ناول نگاری کو زبردست نقصان پہنچایا ورنہ ان کی صلاحیتوں سے انکار نہیں کیا جاسکتا ۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی تمام تر کوتاہیوں کے باوجود وہی اب بھی اردو کے سر والٹر اسکاٹ کہے جاسکتے ہیں۔'' [1]

عملی تنقید کرتے وقت یوسف سرمست کی نظر نہ صرف ادبی و جمالیاتی پہلوؤں پر رہتی ہے بلکہ کسی فن پارے میں اس عہد کے سیاسی ، سماجی و معاشرتی مسائل کی طرف بھی وہ نگاہ رکھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مثلاً نیاز فتح پوری کی ناول نگاری میں جو جمالیاتی رومان پرستی ملتی ہے اس سے بحث کرتے ہوئے انھوں نے اس دور کے ایک ناول نگار کرشن پرشاد کول کے یہاں جو باغیانہ شعور ملتا ہے اس کو سامنے لایا ہے۔ کرشن پرشاد کے ناول ''شیاما'' کا جائزہ لیتے ہوئے یوسف سرمست نے انھیں باغیانہ شعور کا نقیب بھی قرار دیا ہے۔ مثلاً وہ اس ناول پر یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

''شیاما کا اردو ناول نگاری میں صرف اچھی کردار نگاری اور ناول کے فن کو سلیقے سے برتنے کے اعتبار ہی سے ممتاز مقام نہیں رہے گا بلکہ اس کی اہمیت اس بنا پر بھی رہے گی کہ یہ ناول اپنے اندر مباحثی ناول Novel Of Discussion کی بھی بہت سی خوبیاں رکھتا ہے۔ شیاما میں سماجی ، مذہبی بندشوں کے خلاف اس میں بڑی فکر انگیز بحثیں بھی کی گئیں ہیں۔ اس طرح اس ناول میں کشن پرشاد کول نے جس باغیانہ شعور کا ثبوت دیا ہے وہ اس ناول کو بڑی اہمیت بخشتا ہے۔ اس میں بعض سماجی اور مذہبی قدروں سے بغاوت کر کے اور ذہنی طور پر انھیں رد کر کے کشن پرشاد کول نے بیسویں صدی کے اس اہم انقلابی رجحان کو واضح کیا ہے جو مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ

---

[1] ڈاکٹر یوسف سرمست، بیسویں صدی میں اردو ناول، تیسرا ایڈیشن ۲۰۱۶ء، ص ۱۲۱

شدت اختیار کرتا گیا ہے۔اس لئے انھیں باغیانہ شعور کا نقیب کہا جاسکتا ہے۔‘‘ [۱]

اس دور میں میں کئی خواتین ناول نگار اُبھر کر سامنے آئی تھیں۔ان میں صغریٰ ہمایوں مرزا، نذر سجاد حیدر، طیبہ بیگم، خدیجہ جنگ قابل ذکر ہیں۔اس دور میں جتنے بھی ناول لکھے گئے ان کا موضوع تعلیم ہی رہا۔عورتوں کی ناول نگاری پر نذیر احمد سے زیادہ راشد الخیری کا اثر رہا۔اس کی وجہ یہ تھی کہ نذیر احمد نے عورتوں کے لئے صرف تعلیم کی اہمیت وضرورت کو واضح کیا تھا جبکہ راشد الخیری نے اس کے ساتھ عورتوں کی مظلومیت اور مجبوری کو بھی ظاہر کیا تھا۔خواتین ناول نگاروں کے ناولوں کا جائزہ لیتے ہوئے بھی یوسف سرمست نے اس عہد کے سماجی ومعاشرتی زندگی کے مسائل پر نگاہ رکھی ہے، وہ لکھتے ہیں:

’’خواتین ناول نگاروں نے سماجی زندگیوں کی تبدیلیوں کے ساتھ سیاسی مسائل بھی پیش کئے لیکن سماجی اور معاشرتی زندگی ہی مجموعی طور پر ان کی ناول نگاری کا موضوع رہی ہے۔اپنی معاشرتی زندگی کو پیش کرتے ہوئے انھوں نے اپنے زمانے کے بعض رسوم و رواج کو جس طرح بیان کیا ہے اور ہندوستانی زندگی کے پہلوؤں کی جواب مٹ چکے ہیں یا ختم ہوگئے ہیں جس طرح عکاسی کی ہے وہ ان کے ناولوں کو اہمیت بخشتی ہے۔‘‘ [۲]

اس طرح اندازہ ہوتا ہے یوسف سرمست اپنے تنقیدی مطالعات میں نہ صرف ادب کے ادبی پہلوؤں کو پیش نظر رکھتے بلکہ ادیب کے عہد کے سیاسی ومعاشرتی مسائل کی بھی بھرپور عکاسی کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی عملی تنقید سے ان کے معتدل اپروچ کا اندازہ ہوتا ہے۔ پریم چند کا ناول ’’نرملا‘‘ کا جب مطالعہ کیا جاتا ہے تو اس کا پلاٹ گٹھا ہوا ہے۔ پلاٹ کی اس خصوصیت کی وجہ سے اس ناول کی پریم

---

[۱] ڈاکٹر یوسف سرمست۔بیسویں صدی میں اردو ناول، تیسرا ایڈیشن، ۲۰۱۶ء، ص ۱۴۳۔۱۴۴

[۲] ایضاً، ص۔۱۵۱

چند کے دیگر ناولوں میں الگ انفرادیت اور اہمیت ہے۔اس ناول میں پریم چند نے اس کے علاوہ کردار نگاری کا جو پختہ ثبوت دیا ہے باقی کسی سماجی ناول میں بڑی مشکل سے ملے گا۔ پریم چند کے اس ناول پر یوسف سرمست نے بھی عملی تنقید کر کے انھیں خصوصیات کی نشاندہی کی ہے۔ان کے اس مطالعے میں وہ نہ صرف فن کا بڑی گہرائی سے جائزہ لیتے ہیں بلکہ ان کے عہد کے ہندوستان کے سیاسی ،سماجی و معاشی حالات پر بھی گہری نگاہ رکھتے نظر آتے ہیں مثلاً وہ لکھتے ہیں:

> ’’یہ ناول ایک سادا اور بہت گتھے ہوئے پلاٹ کو بھی پیش کرتا ہے۔ پلاٹ کی تعمیر کے لحاظ سے بھی یہ ناول پریم چند کے ناولوں میں بڑی اہمیت رکھتا ہے ۔ پریم چند نے کردار نگاری میں معاشی اور سماجی مسائل کو جس طرح پیش کیا ہے اس سے پہلے یہ فنی پختگی کے دوسرے کسی بھی سماجی موضوع پر لکھے گئے ناول میں نہیں ملتی ۔اصل میں ہندوستان کے سیاسی ،سماجی اور معاشی حالات کے غائر مطالعہ سے ہی ان کے ناولوں میں یہ فنی پختگی پیدا ہوئی ۔ یہ فنی پختگی نرملا کے کردار کی نفسیاتی پیش کش کے لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔‘‘[1]

یوسف سرمست کے اس تجزیہ سے ہمیں یہ بھی علم ہوتا ہے کہ وہ کسی بھی فن پارے کے فن اور موضوعات کا غیر جانبداری سے تجزیہ کرتے ہیں ۔ جہاں انھوں نے پریم چند کے اس ناول کی خوبیوں کی ستائش کی ہے وہیں فنی نقائص پر بھی گہری نظر ڈالی ہے۔ چنانچہ وہ پریم چند کے ناول میں ڈرامائی انداز نہ پیدا کرنے کو ان کے فن کا نقص قرار دیتے ہیں کیوں کہ یوسف سرمست کے مطابق ناول نگاری میں سب سے عمدہ اور بہترین وصف ڈرامائی انداز ہی ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

> ’’پریم چند کی ناول نگاری کی بہت سی کمزوریاں ان کی تکنیک میں جدت سے کام نہ لینے کا نتیجہ ہیں ۔ پریم چند کی ناول نگاری کی بنیاد

---

[1] ڈاکٹر یوسف سرمست ،بیسویں صدی میں اردو ناول، تیسرا ایڈیشن ۲۰۱۶ء، ص ۱۷۰-۱۶۹

اور مرکزی کمزوری یہ ہے کہ وہ ناول میں ڈرامہ کا انداز پیدا نہیں کر سکتے۔ خود ان کے الفاظ میں ناول کو اس طرح شروع کرنا جس سے ڈرامہ کا سا انداز پیدا ہو جائے میرے لئے مشکل ہے۔ دراصل ڈرامائی انداز ناول نگاری میں سب سے عمدہ اور بہترین سمجھا جاتا ہے۔'' [1]

یوسف سرمست ترقی پسند کے متاثر ہیں یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اس عہد کے تمام ناولوں کے مطالعے میں جن موضوعات کی طرف اشارے کیے ہیں وہ اس عہد کے سیاسی و سماجی و معاشی مسائل ہیں۔ سماجی، مذہبی اور اخلاقی بندشوں کو خاطر میں نہ لانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ناول نگاروں میں باغیانہ جذبہ پرورش پانے لگا۔ وہ لکھتے ہیں:

''اس عہد کے تمام ناول نگاروں کی یہی خصوصیت رہی ہے کہ وہ بہت سے سماجی، اخلاقی اور مذہبی مسلمات کے خلاف بغاوت کرتے نظر آتے ہیں۔ یہی باغیانہ جذبہ ترقی پسند تحریک کے شروع ہونے کے بعد شدت اختیار کر گیا۔'' [2]

ادب زندگی کے تلخ حقائق سے پُر ہے۔ یہ غم اور افسردگی کے احساس کو پیش کرتا ہے۔ ادب میں زندگی کی ناپائیداری اور کمزوری کو پیش کیا جاتا ہے۔ یوسف سرمست کے نزدیک میں ادب میں زندگی کے ناپائیداری اور کمزوری نظر آتی ہے۔ خصوصاً ترقی پسند عہد کے ناولوں کا مطالعہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس دور کا ہر سنجیدہ ناول نگار اپنے ناولوں میں اسی احساس کو پیش کرتا ہے۔ خواہ وہ کرشن چندر کی ''شکست'' ہو یا ابراہیم جلیس کا ''چور بازار'' ہر ناول میں زندگی کے تعلق سے یہی احساس جاری و

---

[1] ڈاکٹر یوسف سرمست، بیسویں صدی میں اردو ناول، تیسرا ایڈیشن ۲۰۱۶ء، ص۔۲۰۱

[2] ایضاً

ساری نظر آتا ہے۔'' [1]

تاریخی نظریہ ہمیں مغرب میں ٹین کے یہاں نظر آتا ہے یہ نظریہ اردو میں ان ناقدین کے یہاں دکھائی دیتا ہے جو خصوصیت سے کسی ادیب کی تحریروں میں اُس عہد کے مسائل کو دیکھتے ہیں۔ یوسف سرمست نے پریم چند عہد کے ادیبوں کے مطالعے کے وقت ان کی انفرادیت اس عہد کے حوالے سے جائزہ لیا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''اس دور کی یہ بھی خصوصیت رہتی ہے کہ اس میں ناول کی ہیئت میں کافی تنوع ہوا ہے چونکہ اس دور میں مواد کی نوعیت بدل گئی تھی اس لئے اس کی پیش کشی کے لئے ہیئت میں تبدیلی آئی۔ یہ تنوع اس دور میں اس لئے نمایاں نظر آتا ہے کہ مختلف ناول نگاروں نے اقتصادی طور پر مختلف اقسام میں سے کسی ایک قسم کو اپنایا۔ قاضی عبدالغفار نے عشق پیشہ عاشق و معشوق کو موضوع بنایا۔ عظیم بیگ چغتائی نے مزاحیہ ناول لکھے۔ ظفر نے جاسوسی ناول لکھے اس طرح سے ناول کی مختلف قسموں میں سے کسی ایک رنگ کو اپنانے کا رواج بھی اس دور میں عام ہونے لگا۔'' [2]

یوسف سرمست نے اس عہد کے اہم اور سنجیدہ ناول نگاروں سے بھی بحث کی ہے۔ خصوصاً سجاد ظہیر کے ناول ''لندن کی ایک رات'' کا تفصیلی طور پر جائزہ لیتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ انھوں نے مغربی ناول نگاروں کی ایک تکنیک ''شعور کی رو'' اردو میں سب سے متعارف کروایا چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''لندن کی ایک رات، اردو کا اہم اور اچھوتا ناول ہے۔ اردو میں نہ صرف جدید اردو ناول نگاری کی ابتداء اس سے ہوتی ہے بلکہ اس

---

[1] ڈاکٹر یوسف سرمست، بیسویں صدی میں اردو ناول، تیسرا ایڈیشن ۲۰۱۶ء، ص۔۲۴۳

[2] ایضاً، ص۔۲۱۵

ناول سے اردو ناول نگاری ''شعور کی رو'' کی تکنیک سے سب سے
پہلے متعارف ہوتی ہے۔''[1]

''شعور کی رو'' کیا ہے۔ ناول میں اس تکنیک کا استعمال کس طرح کیا جاتا ہے اور سجاد ظہیر نے اس تکنیک کو کس حد تک استعمال کیا ہے۔ اس کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے اور یہ بتایا کہ اس عہد کے معاشرے کی کیا صورتحال تھی۔ اس عہد کے نوجوانوں کے جذباتی اور نفسیاتی مسائل اور سماجی و معاشرتی حالات کی ترجمانی میں یہ ناول اہمیت رکھتا ہے چنانچہ اس کی اہمیت سے انکار نہ کرنا ان کے نزدیک زبردست کفرانِ ادبی ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''یہ مختصر ناول تہہ در تہہ جذباتی اور نفسیاتی زندگی کی پیچیدگیوں کو ظاہر
کرتے ہوئے ہندوستان کے سیاسی اور سماجی حالات کی بھی پوری
پوری عکاسی کرتا ہے...... اردو میں اس تجربہ کی اہمیت کا انکار کرنا یا
اس کا ذکر نہ کرنا زبردست کفرانِ ادبی ہے۔ 'لندن کی ایک رات'
بہرحال ایک اہم ناول ہے اور اردو ناولوں کے سارے رجحانات کی
آئینہ داری کرنے کی وجہ سے سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔''[2]

یوسف سرمست نے جہاں سجاد ظہیر کے ناول میں شعور کی رو کی تکنیک کی خوبیوں کو سراہا ہے وہیں انھوں نے قرۃ العین حیدر کے ناول ''آگ کا دریا'' میں بھی اس تکنیک کے بھرپور استعمال پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ ساتھ ہی خود کلامی کی تکنیک کی بھی نشاندہی کی ہے۔ انھوں نے شعور کی رو کی تکنیک کی تعریف پیش کرتے ہوئے بتایا کہ اس تکنیک کے ذریعے ہمیں کرداروں کے خیالات اور نفسیات سے آگہی ہوجاتی ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''شعور کی رو، ناول نگاری کی وہ تکنیک ہے جس میں ذہن کی اور

---

[1] ڈاکٹر یوسف سرمست، بیسویں صدی میں اردو ناول، تیسرا ایڈیشن ۲۰۱۶ء، ص۔ ۲۶۰

[2] ایضاً، ص۔ ۲۷۲۔ ۲۷۰

شعور کی بدلتی ہوئی زندگی اور گذرتی ہوئی کیفیات کو اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ ہم کردار کی پوری زندگی اس کی ذہنی فضاء، اس کے ذہنی تجربے، اس کی داخلی زندگی، اس کی گزشتہ زندگی اور حال کے خیالات اور اس کی نفسیات سے واقف ہوجاتے ہیں۔ وہ کمرے کی ساری چیزوں کو جس طرح دیکھ رہا تھا اور محسوس کر رہا تھا وہ ایسے لوگوں اور اسی تہذیب کو اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا، ان لوگوں کے تعلق سے جو کمرے میں موجود ہیں گوتم کے ذہن میں جو خیالات آتے ہیں وہ ہمیں معلوم ہوجاتے ہیں۔ شعور کی رو تکنیک میں داخلی خودکلامی سے بھی لیا جاتا ہے۔'' [1]

اس اقتباس سے یہ بھی علم ہوتا ہے کہ یوسف سرمست اپنی عملی تنقید میں نہ صرف ادیب کے فن اور تکنیک پر بحث کرتے ہیں بلکہ کرداروں کے نفسیاتی مطالعے کو بھی ذہن میں رکھتے ہیں۔

یوسف سرمست عملی تنقید کرتے وقت نفسیاتی عوامل کے علاوہ اس عہد کے تاریخی اور تہذیبی تبدیلیوں کو بھی پیش نظر رکھتے ہیں۔ مثلاً ناول ''آگ کا دریا'' کے کرداروں کے حوالے سے انھوں نے بتایا کہ اس ناول میں ہندوستان کی تاریخ اور تہذیب کی بدلتی ہوئی تبدیلیوں کو کرداروں کے ذریعے پیش کیا گیا۔ اس میں گوتم نام کا کردار ہندو دور میں محور و مرکز کی حیثیت رکھتا ہے لیکن مسلمانوں کے دور میں اس کی حیثیت ثانوی ہے۔ یعنی تہذیبوں کے بدلنے سے کس طرح کردار کی شخصیت کو بدلتی اس کی بہترین عکاسی قرۃ العین حیدر نے کس طرح کی ہے اس کے بارے میں پروفیسر یوسف سرمست لکھتے ہیں:

''ہندوستان کی تاریخ و تہذیب کی انقلابی تبدیلیوں کو قرۃ العین نے گوتم نیلمبر کمال الدین اور چمپا کے حوالے سے پیش کیا ہے۔ گوتم ہندو دور میں محور و مرکز کی حیثیت رکھتا تھا لیکن مسلمانوں کے دور میں

---

[1] ڈاکٹر یوسف سرمست، نظری اور عملی تنقید، دسمبر ۲۰۰۲ء، ص۔۲۳۳

اس کی حیثیت ذیلی وثانوی ہوگئی ہے اسی طرح کمال الدین دربار
جون پور کے امیر کی حیثیت سے آیا تھا لیکن بنگال میں پھلنے پھولنے
کے بعد وہ سیاسی تبدیلیوں کے نتیجے میں مصیبتیں جھیلتا ہوا مرجاتا
ہے۔'' [1]

یوسف سرمست نے عزیز احمد کی ناول نگاری پر بھی اپنی عملی تنقید کی ہے۔ان کے مطابق عزیز احمد نے اپنے ناولوں میں زندگی کو پوری طور پر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔بعض لوگ جوان کے یہاں صرف جنسی جذبات کو تلاش کرتے ہیں اور دوسرے پہلوؤں کو فراموش کردیتے ہیں۔ان سے اختلاف کرتے ہوئے ان کی جذبات نگاری پر یوں روشنی ڈالی ہے۔

''عزیز احمد کی ناول نگاری ہر اعتبار سے اردو ناول نگاری کے ایک
اہم موڑ کی نشاندہی کرتی ہے۔وہ زندگی کی بھرپور طریقے سے پیش
کرنے کی جتنی اور جیسی قوت رکھتے ہیں وہ اردو ناول نگاروں میں
کامیاب ہے لیکن اگر اس کے باوجود ہم ان کی ناول نگاری میں
سوائے جنس کے اور کچھ نہ دیکھ سکیں تو شاید خود ہماری جنس زدگی
ہوگی۔پھر جنسی جذبات کی جیسی لطیف اور حقیقی عکاسی انھوں نے کی
ہے۔اردو کے دوسرے ناول نگار بہت کم کرپائے ہیں۔'' [2]

آگے انھوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ عریاں نگاری اور فحش نگاری میں فرق ہے اور عزیز احمد کے یہاں عریاں نگاری کی نشاندہی کرتے ہوئے وہ اسے ان کے فن کی قدر و قیمت کا سبب مانتے ہیں۔چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''عزیز احمد راست اور کھلے طور پر جنسیت کو پیش کرتے ہیں وہ جنسی

---

[1] ڈاکٹر یوسف سرمست،نظری اور عملی تنقید،دسمبر۲۰۰۲ء ،ص۔۲۳۰

[2] ڈاکٹر یوسف سرمست،بیسویں صدی میں اردو ناول،تیسرا ایڈیشن ۲۰۱۶ء،ص۔۲۸۵

جذبہ کو ذلیل سمجھتے ہیں، نہ ذلیل دکھانے کی کوشش کرتے ہیں اس لئے آج تک ان کی عریاں نگاری فحش نہیں بنی ہے بلکہ اس کے برخلاف جنس کا عنصر ان کی ناول نگاری میں بڑی فنی قدر و قیمت رکھتا ہے۔اس کے علاوہ اردو ناول نگاری کو سچی جنسی محبت کی پیش کشی کی ضرورت بھی تھی۔اس لحاظ سے بھی عزیز احمد کے ناولوں میں جنسی جذبہ کا عنصر بڑی اہمیت رکھتا ہے۔''[1]

''ایسی بلندی ایسی پستی''عزیز احمد کا تیسرا اور بیحد اہم ناول ہے جو ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا۔حیدرآباد ،عزیز احمد کا وطن ہے۔اس ناول میں انھوں نے حیدرآباد کی تہذیبی اور معاشرتی تمدن و سماجی زندگی کا نقشہ فنکارانہ کمال کے ساتھ پیش کیا ہے جو یوسف سرمست کے مطابق ایک عہد کی تہذیبی تاریخ بن گیا ہے۔پروفیسر یوسف سرمست نے احسن فاروقی کے ناول ''شام اودھ'' پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور اس کی خوبیوں اور خامیوں کا جائزہ بھی لیا ہے۔احسن فاروقی کا ناول ''شام اودھ'' ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا۔پروفیسر یوسف سرمست کا کہنا ہے کہ ''شام اودھ'' میں زندگی کی بھرپور عکاسی نہیں ملتی صرف ناول کی ساخت پر توجہ دی گئی ہے اور ناول کی روایتی انداز کارفرما ہے جس سے ناول کی اہمیت مجروح ہوتی ہے۔آگے انھوں نے اس کی ایک اور خامی اس کی ساخت اور بنیاد پر حد سے زیادہ زور دینے کو بتایا ہے جس کی وجہ سے ناول کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

''ناول کی ساخت اور بنیاد پر ضرورت سے زیادہ زور دینے سے ایک اچھے ناول کو بھی جو نقصان پہنچ سکتا ہے اس کی ایک روشن ترین مثال ''شام اودھ'' ہے۔''[2]

انھوں نے ابراہیم جلیس کے ناول ''چور بازار'' پر بھی عملی تنقید کی ہے۔ان کے مطابق ناول ''چور

---

[1] ڈاکٹر یوسف سرمست،بیسویں صدی میں اردو ناول،تیسرا ایڈیشن ۲۰۱۶ء،ص۔۲۸۶

[2] ڈاکٹر یوسف سرمست،بیسویں صدی میں اردو ناول،۲۰۱۶ء،ص۔۳۹۲۔۳۹۳

بازار'' ۱۹۴۶ء میں شائع ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ نہ صرف ہندوستان بلکہ ساری دنیا ایک بحرانی دور سے گزر رہی تھی۔ اس وقت کے نوجوان سوائے اُس کی تلخی کو محسوس کرنے کے اور کچھ نہ کرسکتا تھا۔ چنانچہ اس ناول کا تجزیہ کرتے ہوئے انھوں نے اس عہد کے مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔ اس تعلق سے یوسف سرمست لکھتے ہیں:

> ''چور بازار'' کی اہمیت اور اردو ناول نگاری کی تاریخ میں ہمیشہ اس لئے قائم رہے گی کہ جلیس نے اس زمانے کے سیاسی اور اقتصادی حالات نے جو مایوس کن اثرات نوجوان ذہنوں پر چھوڑے تھے ان کو بھرپور انداز سے پیش کیا ہے۔ خصوصاً ایسے نوجوان جو فارغ التحصیل ہوکر جامعات سے نکل رہے تھے لیکن بیروزگاری کا شکار ہوگئے تھے وہ ان حالات کی تلخی کو بڑی شدت سے محسوس کررہے تھے۔'' [۱]

مذکورہ اقتباس سے ان کے تاریخی مطالعے کا اندازہ ہوتا ہے۔ جب وہ کسی فن پارے کا مطالعہ کرتے ہوئے وہ پہلے عہد کو نظر میں رکھتے ہیں اسکے بعد اس کے مسائل اور سماجی صورتحال کا بھرپور جائزہ لیتے ہیں۔

''چور بازار'' روایتی انداز کا ناول نہیں ہے۔ اس کی ہیئت جدید ہے۔ باوجود اس کے ابراہیم جلیس نے اس کو کامیاب انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی اس ناول کے فن پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کے پیش کشی کے انداز اور جلیس کی ذہانت کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اس ناول میں نہ تو کوئی مسلسل کہانی بیان کی گئی ہے نہ ہی اس کا کوئی مرکزی پلاٹ ہے، نہ ہی اس ناول کا کوئی ہیرو ہے نہ ہی ہیروئن، اس کے باوجود جلیس نے اپنے مواد کو بالکل اچھوتے انداز

---

[۱] ڈاکٹر یوسف سرمست، بیسویں صدی میں اردو ناول، ۲۰۱۶ء، ص۔ ۳۰۴

میں بھرپور طریقے سے پیش کر دیا ہے۔ یہ جلیس کی ذہانت اور اس
ناول کی بڑائی کی دلیل ہے......اردو ناول نگاری میں جلیس کا یہی
ایک ناول انھیں زندہ جاوید بنانے کیلئے کافی ہے۔'' [1]

ادیب ذہنی نفسیاتی، جذباتی مختصر طور پر سینکڑوں داخلی تجربات سے دوچار ہوتا ہے اور ان سب کا ریکارڈ انسانی شعور میں رہتا ہے۔ انسان کے شعور میں علم، فن، فلسفہ اور جغرافیائی اور تاریخی تصورات غرض دنیا جہاں کے سارے واقعات منعکس ہوتے رہتے ہیں۔ نفسیاتی ناول نگار ان سب کو شعور کی رو کے ذریعہ اپنے دائرہ میں لے آتے ہیں۔ لیکن ان باتوں کو رمز و کنایہ کے ذریعہ ہی ظاہر کیا جاسکتا ہے۔ اس کے بارے میں پروفیسر یوسف سرمست لکھتے ہیں:

''شعور کی رو نے ناول کو نئی وسعتیں اور نئی پہنائیاں بخشی ہیں۔
زندگی بے کنارہ اور بے کراں ہے۔ اس لئے ادب کا ہر وہ تجربہ جو
اس کی زیادہ سے زیادہ عکاسی کر سکے مستحسن ہے۔ انسانی شعور ایک
ایسا آئینہ خانہ ہے جس میں ساری کائنات عکس ریز ہوتی ہے۔ ناول
میں انسانی شعور کو پیش کر کے ناول نگاروں نے اپنے لئے بے پناہ
گنجائش پیدا کر لی ہے جوائس اپنے ناول "Finnegans Wake"
میں انسان کے تمام تاریخی شعور کو پیش کرتا ہے۔'' [2]

سنجیدہ ناول کوئی فیصلہ پیش نہیں کرتا ہے۔ بلکہ قاری کو غور کرنے پے مجبور کرتا ہے۔ اس کے بعد قاری خود ہی نتائج اخذ کرتا ہے۔ مقبول ناول نگاروں کے پاس یہ چیز دیکھنے کو نہیں ملتی ہے۔ اس کے پاس اپنے اطراف واکناف کی زندگی کا عکس ملتا ہے۔ وہ تصویر کے دونوں رُخ پیش کرتے ہیں۔ جو کہتے ہیں وہ ثابت کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ سنجیدہ ناول نگاروں اور مقبول ناول نگاروں کے فرق کو مغربی نقاد

---

[1] ڈاکٹر یوسف سرمست، بیسویں صدی میں اردو ناول، ۲۰۱۶ء، ص ۔۳۱۳

[2] ڈاکٹر یوسف سرمست، عرفان نظر، ۱۹۷۷ء، ص۔ ۱۸۶

''ہکس'' کے خیالات کی روشنی میں واضح کرتے ہوئے پروفیسر یوسف سرمست لکھتے ہیں:

''سنجیدہ ناول نگار فیصلے صادر نہیں کرتا بلکہ وہ تصویر کے دونوں رُخ پیش کر دیتا ہے اور قاری کو مجبور کر دیتا ہے کہ وہ خود ہی غور وفکر کر کے خود ہی نتائج اخذ کرے۔ مقبول ناول نگاروں کے پاس یہ تمام باتیں نہیں ملتیں۔ نہ تو ان کے پاس اپنی زندگی اور اپنے اطراف کی زندگی کی ایسی بھرپور آ گہی ملتی ہے نہ تو ہمارے تجربے میں وہ کوئی اضافہ کرتے ہیں اور نہ ہی ان کو پڑھنے کے بعد ہم کو اپنے تجربات کی قدر و قیمت کا احساس ہوتا ہے۔ وہ تصویر کا ایک رُخ پیش کرتے ہیں اور اس کی وکالت بھی کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مقبول ناول نگاروں کو پڑھنے سے نہ تو ذہن کے دریچے کھلتے ہیں نہ ہی فکر و خیال مہمیز لگتی ہے۔'' [1]

سنجیدہ ناول نگاری بڑی اہمیت رکھتی ہے اور زندگی کی بھرپور آ گہی اور پیش کشی سے عہد آفریں کارنامے انجام دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یوسف سرمست کا ماننا ہے کہ سنجیدگی سے ناول نگاری کی طرف توجہ دینا چاہئے جبکہ عصر حاضر میں جو ناول نگاری ہو رہی ہے وہ تجارتی مانگ کی وجہ سے مقبول ادیب بھی سنجیدگی سے فن کی طرف توجہ نہیں دے پا رہے ہیں جبکہ یوسف سرمست کے مطابق ادیب اسی وقت قلم اُٹھاتا ہے جبکہ زندگی کا کوئی گہرا اور بھرپور تجربہ اسے اظہار پر مجبور کر دے چنانچہ اپنے انہیں خیالات کو پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سنجیدہ ناول بے حد کم لکھے جاتے ہیں۔ سنجیدہ ناول اس لئے لکھے جاتے ہیں کہ نہ صرف سنجیدہ ناول نگار اپنے ناول کو خوب سے خوب تر بنانے کیلئے ریاضت کرتا ہے بلکہ اس وقت قلم اُٹھاتا ہے جب

---

[1] ڈاکٹر یوسف سرمست، بیسویں صدی میں اردو ناول، تیسرا ایڈیشن ۲۰۱۶ء، ص۔ ۳۴۷

زندگی کا کوئی گہرا اور بھرپور تجربہ اُس کو اس کے اظہار پر مجبور کر دیتا ہے۔ظاہر ہے کہ زندگی کے بڑے اور گہرے تجربات بار بار حاصل نہیں ہوتے۔اس کے برخلاف مقبول ناول نگار سینکڑوں ناول لکھا کرتے ہیں۔ وہ تجارتی مانگ کے مطابق اپنے ناول لکھتے ہیں۔ اصل میں یہ ناول نگار ایک فارمولہ بنا لیتے ہیں اور اس کے مطابق ناول گھڑے جاتے ہیں۔''[1]

غرض یوسف سرمست نے اردو کے بعض اہم ناول نگاروں پر عملی تنقید کر کے اپنی تنقید سے اپنے نظریہ کی وضاحت بھی کی ہے۔ان کے نظریات میں وہ زیادہ تر سائنٹفک اپروچ کے حامل نظر آتے ہیں۔ انھوں نے عملی تنقید میں بھی اس طریقے کو اپنایا ہے اور ناولوں کے موضوعات اور فن پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کے پیش کشی کے انداز اور طریقے کار کی خوبیوں اور خامیوں کی نشاندہی بھی کی ہے۔ وہ اپنے مطالعات میں متوازن رویۂ رکھتے ہیں اور اعتدال سے خوبیوں اور خامیوں کے بیان میں حد سے زیادہ تجاوز نہیں کرتے بلکہ اپنے معروضات کو دلائل کے ذریعے پیش کر دیتے ہیں۔

گری راج کشور کا ایک ہندی ناول ''ڈھائی گھر'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔اس ناول کو ساہتیہ اکاڈمی نے اپنے انعام سے نوازا ہے۔اس کا ترجمہ اردو میں حیدر جعفری نے کیا ہے لیکن یہ ترجمہ نہیں بلکہ طبع زاد تصنیف محسوس ہو رہی ہے۔اس حوالے سے پوفیسر یوسف سرمست لکھتے ہیں:

''اردو دنیا کو حیدر جعفری سید کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ انھوں نے ایک اہم ناول سے ہمیں متعارف کروایا ''ڈھائی گھر'' گری راج کشور کا ہندی ناول ہے۔ساہتیہ اکاڈمی نے اسے انام دے کر بجا طور پر اس کی اہمیت کا اعتراف کیا ہے۔ حیدر جعفری نے اس کا ترجمہ اردو میں کیا ہے۔ترجمے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہوتی ہے

---

[1] ڈاکٹر یوسف سرمست،بیسویں صدی میں اردو ناول،تیسرا ایڈیشن ۲۰۱۶ء،ص ۳۵۳۔۳۵۴

کہ پڑھنے والے کو یہ احساس نہ ہو کہ وہ ترجمہ پڑھ رہا ہے۔ بلکہ یہ
محسوس کرتے کہ وہ طبع زاد تصنیف کا مطالعہ کر رہا ہے۔ حیدر جعفری
کے ترجمے میں یہ پوری طرح موجود ہے۔" [1]

2.2 ۔ افسانہ نگار

یوسف سرمست نے ناول نگاروں کے ساتھ ساتھ افسانہ نگاروں پر بھی عملی تنقید کی ہے۔ انھوں نے جن افسانہ نگاروں کے فن پر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے ان میں پریم چند، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، انتظار حسین اور اقبال متین وغیرہ کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔

افسانہ نگاری کے میدان میں پریم چند کو اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ اس صنف کو فن کی بلندیوں تک پہنچانے میں پریم چند کا اہم کردار ہے۔ یوسف سرمست نے پریم چند کے افسانوی ادب کا تفصیل سے جائزہ لیتے ہوئے اُس کی خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے۔ پریم چند پر عملی تنقید کرتے وقت انھوں نے نہ صرف ان کے موضوعات پر روشنی ڈالی بلکہ فن کو بھی نظر میں رکھا ہے۔ یعنی عملی تنقید میں مواد ماہیئت دونوں ہی ان کی نگاہ میں رہتے ہیں۔ جس سے ہمیں ان کے انداز نقد کا اندازہ ہوتا ہے۔ مثلاً ایک اقتباس اس سلسلے میں ملاحظہ کیجیے جس میں وہ ان کے فن اور موضوعات دونوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"پریم چند کا سب سے بڑا ادبی کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اردو
کے افسانوی ادب میں فنی رکھ رکھاؤ کے ساتھ مقصدیت کو فروغ
دیا۔ آزادی کا حصول پریم چند کے افسانوی ادب کا مبتداء بھی ہے
اور انتہا بھی۔ انھوں نے اس کے ساتھ ساتھ ہندوستانی زندگی کے
تمام ترین مسائل کو اپنے افسانوی ادب کا محور و مرکز بنا دیا۔" [2]

پریم چند پر ان کی تنقید سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ پریم چند کے فن کی اہمیت کے قائل ہیں۔ اس

---

[1] ڈاکٹر یوسف سرمست، ادب میں نوبل انعام ادبی یا سیاسی اور دوسرے مضامین ۲۰۱۰ء، ص ۲۲۶

[2] ڈاکٹر یوسف سرمست، ادب۔ نقد حیات، ۱۹۹۳ء، ص۔ ۵۴

کی وجہ یہ بھی ہے کہ پریم چند نے جو کچھ لکھا وہ اپنے عہد کے اور اپنے معاشرے کے مسائل تھے۔ جبکہ اس عہد میں مغرب کے جن تحریکات کے اثرات ہندوستان پر پڑے جس کی وجہ سے ہندوستان میں جو ادب تخلیق پا رہا تھا وہ دو گروہوں میں بٹا ہوا تھا۔ جس کی وابستگیاں الگ الگ تھیں۔ اسی لئے یوسف سرمست اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ ادب کو کسی بیرونی تحریک کے زیر اثر دیکھنے کے بجائے اپنے معاشرے اور اپنے عہد کے مطابق تخلیق کرنا چاہئے جس سے خود مصنف کی وابستگی ہوتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ پریم چند کے فن میں انھیں خصوصیات کی انھوں نے نشاندہی کی ہے جو اس عہد کے دوسرے ادیبوں کے یہاں انھیں نظر نہیں آتی۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے پریم چند کے عہد کے ادیبوں سے سخت اختلاف کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ’’پریم چند کی روایت کو ترک کرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہماری جدید کہانیوں کا موضوع بول و براز تک بن گئے ہیں کیونکہ بعض کارِ حقیقت کے کیڑوں کو صرف اسی میں تلاش کر سکتے ہیں۔ ان سب باتوں سے قطع نظر آج ادب دو گروہوں میں بٹا ہوا ہے، جس کی وابستگیاں مختلف ہیں اس میں سے کسی کی وابستگی ہندوستان سے نہیں ہے یہ وابستگی ہم کو صرف پریم چند کے پاس سے ملتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ پریم چند کے پاس آج ادب کی طرح مانگنے کا اُجالا نہیں ملتا بلکہ اس کی روشنی خون وجگر کی نمود سے ہوئی ہے۔ اسی روشنی سے انھوں نے اپنا سفر بھی طئے کیا اور اپنی منزل بھی پائی۔‘‘[1]

یوسف سرمست نے صرف پریم چند کی افسانہ نگاری کی عظمت کو تسلیم ہی نہیں کیا بلکہ ان ناقدین سے اس بات سے اختلاف بھی کیا جو ان کے افسانہ ’’کفن‘‘ کی حد سے زیادہ تعریفیں کی اور دیگر افسانوں کو نظر انداز کر دیا جبکہ ان کا ماننا ہے کہ ان کے دیگر افسانے بھی اہم ہیں، اپنے اسی خیال کو پیش کرتے ہوئے

---

[1] ڈاکٹر یوسف سرمست، ادب۔ نقد حیات، ۱۹۹۳ء، ص۔ ۶۵

وہ لکھتے ہیں:

> ''پریم چند کا افسانہ ''کفن'' نہ صرف اُن کا شاہکار سمجھا جاتا ہے بلکہ اردو تنقید اور شاید ہندی نے بھی اس کو اتنی اور ایسی اہمیت بخش دی ہے کہ صرف یہی افسانہ پریم چند کی ساری افسانہ نگاری کا حاصل معلوم ہوتا ہے۔ اردو کا ایک نقاد بھی ایسا نہیں ملتا جس نے اس کو حد سے زیادہ نہ سراہا ہو۔ حد یہ کہ آج پریم چند کی ساری افسانہ نگاری کا ایک طرح سے یہ کفن بن چکا ہے۔ اس کے سراہانے پر ہی پریم چند کی افسانہ نگاری کی بے زبانی دیکھی جا سکتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض فنکاروں کے پاس ان کی کوئی کتاب یا بعض وقت کا کوئی ایک تخلیقی کارنامہ، ان کی ساری ادبی زندگی کا حاصل ہوتا ہے۔''[1]

کرشن چندر ہماری زبان کے نہایت مقبول اور ہر دلعزیز افسانہ نگار ہیں۔ یوسف سرمست نے کرشن چندر پر عملی تنقید کرتے وقت الگ کتاب ''اردو افسانہ نگاری میں کرشن چندر کی انفرادیت'' کے عنوان سے تصنیف کی ہے جس میں انھوں نے ان کی افسانہ نگاری کی انفرادی خصوصیات پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ ان کے مطابق ان کی افسانہ نگاری کی انفرادی خصوصیت ان کا انداز تحریر بتایا ہے۔ کرشن چندر کی افسانہ نگاری کی شروعات رومانی کہانیوں سے ہوئی۔ لیکن یوسف سرمست کے مطابق کرشن چندر نے رومان اور حقیقت میں توازن کو ملحوظ رکھا ہے۔ ان کے اسلوب کی انھیں خصوصیات کی نشاندہی کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> کرشن چندر اردو کے بہت بڑے افسانہ نگار اور ناول نگار ہیں۔ وہ ایک منفرد انداز تحریر رکھتے تھے۔ ان کی اسلوب کی دلکشی اور

---

[1] ڈاکٹر یوسف سرمست، ادب۔ نقد حیات، ۱۹۹۳ء، ص۔ ٦٦

خوبصورتی نے بھی ان کے افسانوی ادب کو مقبول بنانے میں بڑا حصہ ادا کیا۔ ان کے افسانوں کو رومان اور حقیقت کا بڑا ہی متوازن اور دیدہ زیب امتزاج ملتا ہے۔ انھوں نے مغربی افسانے کے اثر کو بھی قبول کیا لیکن اس انداز میں جس سے ان کی انفرادیت اور نکھر گئی۔ ترقی پسند تحریک سے ابتداء ہی سے وابستہ رہے۔ ترقی پسند افسانہ نگاری کو انھوں نے بلند مقام تک پہنچایا۔'' [1]

جیسے کے پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے کہ عملی تنقید کرتے وقت یوسف سرمست مواد اور ہیئت دونوں کو اہمیت دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تنقید میں بھی ایک توازن نظر آتا ہے۔ کرشن چندر کی افسانہ نگاری کا مطالعہ کرتے وقت انھوں نے ان کے مواد اور اسلوب دونوں کی ستائش کی ہے اور ان کی خوبی کو بھی سراہا ہے۔ جہاں کرشن چندر دو متضاد چیزوں کو اپنے فن میں ایک ساتھ ڈھال کر اس کا خوبصورت امتزاج پیدا کرتے ہیں جس کی وجہ سے یہ دونوں چیزیں اپنی مخصوص خصوصیات کے ساتھ اور زیادہ نکھر کر سامنے آتی ہیں۔ مثلاً کرشن چندر نے مواد کو اسلوب کے ساتھ کس طرح پیش کیا اس کی نشاندہی کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''کرشن چندر اپنے مواد کو اسلوب کے خوبصورت سانچے میں اس طرح ڈھالتے ہیں کہ ایک طرف مواد خود طرح دار بن جاتا ہے۔ دوسری طرف اسلوب کی لطافت مواد کی کثافت سے آئینہ بن جاتی ہے۔ غالبؔ اسی وجہ سے کہتے ہیں:

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا'' [2]

---

[1] ڈاکٹر یوسف سرمست، اردو افسانہ نگاری میں کرشن چندر کی انفرادیت، ۲۰۱۲ء، ص۔ ۳۹

[2] ایضاً، ص۔ ۶۷

کرشن چندر کو افسانہ نگاری کے فن میں بہت مہارت حاصل تھی ۔انھوں نے دیہات اور شہری ، دونوں زندگیوں کا نہایت گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔ان کے افسانوں میں حقیقت پسندی کا رجحان بھی ملتا ہے ۔رومان اور حقیقت کا خوبصورت امتزاج بھی ان کے افسانوں کا خاص وصف ہے۔اسی وصف کی نشاندہی کرتے ہوئے یوسف سرمست لکھتے ہیں:

> ''کرشن چندر کی افسانہ نگاری کی سب سے بڑی خصوصیت اس کی انفرادیت ہے کیونکہ کسی بھی اور افسانہ نگار نے حقیقت اور رومانیت کا ایسا خوبصورت امتزاج پیش نہیں کیا جیسا کہ کرشن چندر کے افسانوں میں ملتا ہے۔کرشن چندر کے پاس فطرت اور قدرت کے حسن کا شدید احساس ہے۔انھوں نے واقعیت اور حقیقت نگاری کا پہلا درس کشمیر کے حسین مناظر سے حاصل کیا کیونکہ اس حسن کے پہلو بہ پہلو انسان کی پیدا کردہ بدصورتی تھی یعنی غریب انسانوں کی مجبوری ، بے چارگی اور افلاس تھا ۔کرشن چندر نے ہر جگہ اپنے افسانوں میں اس تضاد کو پیش کیا۔'' [1]

یوسف سرمست نے کرشن چندر کے افسانوں میں جو تکنیک استعمال ہوئی ہے اس کا جائزہ بھی لیا ہے ۔مثلاً ابعاد ثلاثہ (Three Demention) کی تکنیک اور فلیش کی تکنیک کی مثالیں ان کے افسانے ''ان داتا'' اور '' بھگت رام'' کے تجزیے کے ذریعے پیش کی ہے۔ان کی تکنیک کے استعمال کے طریقے کی وضاحت کرتے ہوئے ان کی اس خصوصیت کو انھوں نے سراہا ہے ۔ چنانچہ ''ان داتا'' کے حوالے سے وہ لکھتے ہیں:

> ''کرشن چندر کبھی پامال تکنیک استعمال نہیں کرتے ۔انھوں نے اردو افسانے میں تکنیک کے جتنے اور جیسے تجربے کئے ہیں وہ کسی اور

---

[1] ڈاکٹر یوسف سرمست، اردو افسانہ نگاری میں کرشن چندر کی انفرادیت، ۲۰۱۲ء، ص۔ ۶۹

افسانہ نگار سے ممکن نہ ہو سکے۔''ان داتا'' کی تکنیک کو ابعاد ثلاثہ
Three Dimentional کہا جاتا ہے ۔ یہ تکنیک سینما میں بھی
استعمال کی گئی ہے۔تصویر میں صرف لمبائی اور چوڑائی ہی نظر آتی
ہےلیکن جب اس میں گہرائی یا موٹائی بھی دکھائی جائے تو تصویر
حقیقت سے زیادہ قریب معلوم ہوتی ہے جیسے بت تراشی یا مجسمہ
سازی میں صرف لمبائی اور چوڑائی ہی دکھائی نہیں دیتی بلکہ گہرائی یا
موٹائی بھی نظر آتی ہے۔''[1]

جس طرح ابعاد ثلاثہ کی تکنیک کی تعریف پیش کرتے ہوئے انھوں نے اس کی وضاحت کی ہے اسی طرح فلیش بیک کی تکنیک کی وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے افسانہ''رام بھگت'' کی مثال پیش کی ہے۔مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''بھگت رام'' کے پلاٹ میں فلاش بیک Flash Back کی تکنیک
استعمال کی گئی ہے۔ یہ تکنیک اکثر فلم میں استعمال ہوتی ہے۔زمانہ
حال میں واقع ہونے والے واقعہ سے جب ماضی کے واقعات کے
سلسلہ بیان کئے جاتے ہیں یا دکھائے جاتے ہوں تو اسے فلیش
بیک کہا جاتا ہے۔''بھگت رام'' میں بھی جب راوی یعنی کہانی بیان
کرنے والا کی انگلی کو اسی کا بچہ دانتوں سے کاٹ لیتا ہے تو وہ اپنے
بچے کو تھپٹر مار دیتا ہے۔اس واقعہ سے اپنے بچپن کا وہ واقعہ یاد آتا
ہے کہ بھگت رام کا اس نے انگوٹھا چبا ڈالا تھا لیکن بھگت رام نے
اسے چانٹا نہیں مارا تھا بلکہ کھانے کے لئے سیب اور آلوچے دیئے
تھے۔اس واقعہ سے راوی کو بھگت رام اور اس سے وابستہ ساری

---

[1] ڈاکٹر یوسف سرمست،اردو افسانہ نگاری میں کرشن چندر کی انفرادیت،۲۰۱۲ء،ص۔۹۵

باتیں اور واقعات یاد آ جاتے ہیں۔‘‘[1]

یوسف سرمست نے کرشن چندر کے افسانوں کے موضوعات، اسلوب اور تکنیک کے ساتھ ساتھ کردار نگاری کا بھی بھرپور جائزہ لیا ہے۔ لیکن کرداروں کے تجزیہ میں ان کی نظر بھی انسانی زندگی اور اس کے روشن پہلوؤں پر رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کرشن چندر کے افسانوں کے مطالعے میں کرداروں کو اس کے ماحول اور زندگی کے عناصر سے مملو بتاتے ہیں۔ مثلاً ان کے افسانہ ’’شمع کے سامنے‘‘ کے کرداروں کا جائزہ لیتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> ’’شمع کے سامنے‘‘ کی کردار نگاری کئی خصوصیات کی حامل ہے۔ اس افسانے میں جتنے بھی کردار ملتے ہیں وہ بہت روشن اور زندگی سے معمور ہیں جو کردار سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے اور مرکزی حیثیت رکھتا ہے وہ ہے شمع کا کردار جو افسانے کا عنوان بھی ہے۔ شمع ایک خانہ بدوش قبیلے کی لڑکی ہے۔ شمع کے ساتھ اس کی سہیلی مرجانہ ہے۔ خانہ بدوش میں محنت اور سخت کوشی جزوے زندگی ہوتی ہے۔ خانہ بدوشوں کو طرح طرح کے حالات اور مختلف لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ اسی وجہ سے شمع بہت ہی نڈر اور بے باک ہے۔ وہ خوبصورت بھی ہے اور بہادر بھی۔ بہترین نشانہ باز بھی اور مسحور کن رقاصہ بھی یہ افسانے کا بڑا تابناک کردار ہے۔‘‘[2]

اسی افسانے میں ایک اور جگہ انھوں نے اسی بات کو نہایت وضاحت سے سمجھاتے ہوئے ان کرداروں کی پیش کشی کو سراہا ہے اور بتایا ہے کہ اگر کرشن چندر شمع اور شاہ زماں کو آخر میں جدا ہونے پر افسانہ ختم نہ کرتے تو حقیقت پسندی اس میں نظر نہ آتی کیوں کہ ہندوستانی سماج اور یہاں کی تہذیب کا

---

[1] ڈاکٹر یوسف سرمست، اردو افسانہ نگاری میں کرشن چندر کی انفرادیت، ۲۰۱۲ء، ص۔ ۱۳۹

[2] ڈاکٹر یوسف سرمست، اردو افسانہ نگاری میں کرشن چندر کی انفرادیت، ۲۰۱۲ء، ص۔ ۱۶۳

تقاضہ یہی ہوتا ہے کہ یہاں کے لوگ ایثار و قربانی بڑوں کا بھی خیال رکھتے ہیں، جس کی وجہ سے کرشن چندر نے یہاں کی زمین سے انسان کی اس وابستگی کو قائم رکھا۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:

> ''افسانے میں کرشن چندر نے اپنے نقطۂ نظر کو بہت خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ شمع اور شاہ زماں کا آخر میں اپنی اپنی راہوں پر ایک دوسرے سے الگ ہوکر چلا جانا ہی بڑی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اس بات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ افسانہ اپنی تہذیب، اپنی روایات اور اپنے ماحول، طریقے اور بود و باش سے الگ نہیں ہوسکتا۔ اگر وہ زبردستی ایسا کرتے تو اسی بات کا امکان ہوتا ہے کہ وہ اپنی زمین سے الگ ہوکر دوسری جگہ پھل پھول نہ سکے۔ اسی لئے صلابت روی اسی میں ہے کہ انسان اپنی چیزوں سے وابستہ رہے۔'' [1]

غرض یوسف سرمست کے اس مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ادیب کو اپنے ماحول اور تہذیب کے گہرے رشتے سے وابستہ دیکھنا چاہتے ہیں یہاں ان کا نظریہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ حقیقت پسندی کے قائل ہیں اور ادیب کے اپنی زمین کے رشتے سے جُڑے رہنے کو تلاش کرتے ہیں۔

یوسف سرمست کے مطالعات میں صرف ادیب کا عہد، ادیب کے عہد کے معاشرتی حالات، سماجی عوامل اور تہذیبی اقدار ہی اہمیت نہیں رکھتے بلکہ اسلوب کی اہمیت کو بھی انھوں نے پیش نظر رکھا ہے لیکن ساتھ ہی ہمیں ان کی تحریروں میں خاص بات یہ بھی نظر آتی ہے کہ وہ نفسیاتی عوامل کو بھی اپنے تجزیے نظر میں اہمیت دیتے ہیں۔ مثلاً راجندر سنگھ بیدی کے افسانوں کا تجزیہ کرتے ہوئے انھوں نے یہ بتایا کہ یہ بیدی کے فن کا خاص وصف ہے کہ وہ کرداروں کے نفسیاتی عوامل کی پیش کشی کے ذریعے انسان کی باطنی زندگی کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ افسانہ حقیقت بن کر سامنے آتا ہے اور یہی خصوصیت ان کے افسانوی ادب کو قابل قدر بنا دیتی ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:

---

[1] ڈاکٹر یوسف سرمست، اردو افسانہ نگاری میں کرشن چندر کی انفرادیت، ۲۰۱۲ء، ص۔ ۱۷۷

''بیدی کے افسانوی فن کا کمال ان کی نفسیاتی بصیرت میں ظاہر رہتا ہے۔ بیدی واقعات کو نہیں بلکہ ان واقعات کے پیچھے جو نفسیاتی محرکات کام کرتے ہیں، انھیں پیش کرتے ہیں۔ اسی طرح بیدی کرداروں کے اعمال ہی کا نہیں بلکہ ان اعمال کو بروئے کار لانے میں جو نفسیاتی عوامل کام کرتے ہیں ان کا بھی احاطہ کرتے ہیں۔ اصل میں باطنی زندگی کی یہ عکاسی ہی افسانہ نگار کا حقیقی منصب ہے۔ اس کی پیش کش کی وجہ سے افسانہ نگار حقیقت بن جاتا ہے اور حقیقت افسانہ بنتی ہے۔ بیدی نازک ترین نفسیاتی کیفیات کو اس فنکارانہ چابک دستی سے پیش کرتے ہیں کہ قاری ایک نئی بصیرت حاصل کرتا ہے۔ انسانی زندگی کی ایسی ہی آگہی کسی کے بھی افسانوی ادب کو قابل قدر بناتی ہے۔''[1]

راجندر سنگھ بیدی کے افسانوں میں جو چیز بہت نمایاں ہے وہ ان کی گہری جذباتیت ہے، لیکن یہ جذباتیت سستی اور بے روح نہیں بلکہ نفسیات کا تسلی بخش اور کسی حد تک معاشرہ کی ذہنی ابتری کی تصویر ہے۔ بیدی نے افسانوں کا مواد گرد و پیش کی زندگی سے حاصل کیا ہے۔ معمولی واقعات زندگی کی مختلف کشمکش، ازدواجی زندگی کی پیچیدگیاں، معاشی اُلجھنیں، یہی موضوعات ان کے افسانوں میں رنگ بھرتے ہیں۔

یوسف سرمست نے انتظار حسین کی افسانہ نگاری کا بھی تجزیہ کیا ہے۔ انتظار حسین نے ناول، افسانے، آپ بیتی لکھنے کے علاوہ تنقید بھی کی ہے۔ ان کی تنقید کی کتاب ''علامتوں کا زوال'' اس سلسلے میں اہم ہے۔ یوسف سرمست نے انتظار حسین کے افسانوں کا مطالعہ کرتے وقت ان کی تنقید نگاری کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

---

[1] ڈاکٹر یوسف سرمست، ادب۔ نقد حیات، ۱۹۹۳ء، ص۔ ۹۰

''وہ بہت اچھے نقاد ہیں لیکن اس کی حیثیت سے شاید ان کو اب تک دیکھا ہی نہیں گیا ہے۔ ان کی کتاب ''علامتوں کا زوال'' تنقیدی مضامین کی حیثیت سے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔''[1]

یوسف سرمست انتظار حسین کے افسانوں کا تجزیہ کرتے وقت ان کے تنقیدی رویہ کی شمولیت کو تسلیم کرتے ہیں کیوں کہ انتظار حسین نے اپنے افسانوں میں تجربے کی اہمیت کو پیش کیا ہے۔ اور اسی بات پر اپنی تنقید میں بھی اصرار کرتے ہیں۔ کیوں یوسف سرمست بھی تنقید میں تجربات کی اہمیت پر زور دیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ انھوں نے انتظار حسین کی اس خاص انفرادیت کی نشاندہی کرتے ہیں۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''انتظار حسین نے بجا طور پر تجربے کی اہمیت پر بہر حال اصرار کیا ہے اور وہ اس بات پر بھی زور دیتے ہیں کہ زندگی کے تجربے کو جب ہم افسانے میں پیش کرتے ہیں تو ہمیں بعض باتوں کو ملحوظ رکھنا ہوتا ہے۔ وہ حقیقت نگاری ہو یا تجریدی اور علامتی فکشن۔ اگر افسانہ نگار تجربے کو اپنی تمام تر گہرائی اور گیرائی کے ساتھ پیش کرنے سے قاصر ہوتا ہے تو پھر وہ مختلف طریقے سے ان کوتاہیوں کو پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ دراصل انتظار حسین کا تنقیدی شعور ہی ہے جو انھیں منفرد افسانہ نگار بناتا ہے۔ افسانہ نگاری میں ان کی جدت کی ''قدامت پسندی'' کا نتیجہ ہے اور اس ''قدامت پسندی'' کی نظریاتی بنیادیں ہیں۔ یہ صرف جذباتی وابستگی اور نوسٹلیجا کا معاملہ نہیں۔ ان کا یہی انداز فکر ان کو اردو افسانہ نگاری میں بلند اور منفرد

---

[1] ڈاکٹر یوسف سرمست، ادب کا نوبل انعام ادبی یا سیاسی اور دوسرے مضامین ۲۰۱۰ء ، ص۔ ۱۴۶

مقام عطا کرتا ہے'' [1]

انتظار حسین کی افسانہ نگاری کے اس مطالعے میں انھوں نے ان کی جو انفرادیت جو تجربے کی بنا پر آتی ہے۔لیکن یہی جدت ان کے یہاں روایت پرستی کی وجہ سے در آئی ہے۔ جسے یوسف سرمست ان کی ''قدامت پسندی'' کہتے ہیں۔ ان نظریات سے یہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ یوسف سرمست اپنے تنقیدی مطالعات میں ادیب کی روایت پرستی اور تجربے کی اہمیت کو بھی تسلیم کرتے ہیں۔ الگ الگ افسانہ نگاروں کے فن پر عملی تنقید کرتے وقت یوسف سرمست نے ان کے یہاں مشرقی اقدار کی اہمیت، اپنی تہذیبی اقدار کا لحاظ، اپنے عہد کے ماحول اور زندگی کے مسائل اور روایت اور تجربے کی اہمیت سبھی کو تسلیم کیا ہے۔ساتھ یہی وہ نفسیاتی عوامل کے مطالعے کو بھی ضرور سمجھتے ہیں۔

پروفیسر یوسف سرمست نے اپنے مطالعات میں اسلوب اور تکنیک کو بھی نظر میں رکھا ہے۔خصوصاً اسلوب اور تکنیک کا ذکر کرشن چندر کے سلسلے میں پیچھے آ چکا ہے۔اس سلسلے میں انھوں نے عصر حاضر کے ادیبوں کے یہاں بھی ان کے مخصوص اسلوب اور تکنیک کو بھی سراہا ہے۔مثلاً اقبال متین کو انفرادی اسلوب ہی کی بدولت ''صاحب طرز ادیب'' قرار دیتے ہیں۔اقبال متین کے اسلوب کی خصوصیات کو جس انداز سے نشاندہی کی ہے وہاں ان کا جمالیاتی نقطۂ نظر سامنے آتا ہے مثلاً وہ لکھتے ہیں:

> ''صاحب طرز ادیب کی تعریف ''اقبال متین کے الفاظ میں'' ایسا ادیب جس کی تحریر ہزاروں میں پہچانی جائے۔ اس کے ساتھ وہ ادیب جو ''جلال و جمال'' دونوں کی صورت گری و پیکر طرازی میں حاکمانہ دسترس رکھتا ہو۔ صاحب طرز ادیب اپنے قلم سے جو جادو جگاتا ہے۔اس کے بارے میں اقبال متین لکھتے ہیں وہ ''بند حجرے میں چاندنی بکھیرنے'' اور ''پھولوں کی خوشبو'' کو اپنی گرفت میں لینے کا فن جانتا ہے۔''زبان بیان کو برتنے'' کا ایسا ملکہ جو ہر کیفیت

---

[1] ڈاکٹر یوسف سرمست، ادب کا نوبل انعام ادبی یا سیاسی اور دوسرے مضامین ۲۰۱۰ء ص ۱۶۴

اور حالت کو دلنشین اور موثر انداز میں ادا کر سکے ہر مصنف کے بس
کی بات نہیں ہوتی۔ صاحب طرز ادیب صرف اپنے حسن بیان سے
اپنی طرف متوجہ کر لینے کی جو قوت اور طاقت رکھتا ہے۔'' ۱؎

نہ صرف اقبال متین کا اسلوب یوسف سرمست کی نگاہ میں رہتا ہے بلکہ وہ ان کے افسانوں کی تکنیک پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ مثلاً وہ اقبال متین کے افسانوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے ان کے ہاں تلازمہ خیال (Free Association) تکنیک کے استعمال اور اس کے طریقہ کار کی وضاحت کرتے ہوئے اس کا یوں تجزیہ کرتے ہیں:

''اقبال متین کے ہاں آزاد تلازم خیال Free Association of
India کی تکنیک ملتی ہے۔ یہ تکنیک اصل میں شعور کی رو Stream
of Consciousness ہی کی پیدا کردہ ہوتی ہے۔ وہ علی اختر اور
صفی اورنگ آبادی کا ذکر کر رہے تھے۔ علی اختر کی وجہ سے اُن کا
خیال نیاز کی طرف منتقل ہوتا ہے۔'' ۲؎

2.3 ۔ انشائیہ نگار

پروفیسر یوسف سرمست نے نہ صرف اردو کے ناول نگاروں اور افسانہ نگاروں پر عملی تنقید کی ہے بلکہ انشائیہ نگاروں کے فن پر بھی اپنے تجزیئے پیش کئے ہیں۔ خصوصاً مولانا آزاد کی انشائیہ نگاری کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے انھوں نے جس چیز کی نشاندہی کی ہے وہ ان کا فلسفہ ہے اور یہ فلسفہ یوسف سرمست کے مطابق انھیں مذہب اور خدا کے یقین سے ہی ملا چنانچہ وہ اپنے انہیں خیالات کو پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مولانا آزاد کا فلسفہ بھی ان کی شخصیت سے ہم آہنگ ہے۔ ان کو

۱؎ ڈاکٹر یوسف سرمست، ادب کا نوبل انعام ادبی یا سیاسی اور دوسرے مضامین ۲۰۱۰ء ص ۵۳

۲؎ ڈاکٹر یوسف سرمست، ادب کا نوبل انعام ادبی یا سیاسی اور دوسرے مضامین ۲۰۱۰ء ص ۶۲

اس معمہ ہستی کا حل مذہب اور خدا میں ملا ہے۔ لیکن خود مذہب اور
خدا تک مولانا کی رسائی جو ہوتی ہے وہ فلسفہ کے ہی ذریعہ ہوتی ہے
اور ان کا تمام تر فلسفہ مذہب اور خدا کے یقین سے ترکیب پاتا ہے
اس میں کوئی شک نہیں کہ مذہب اور خدا پر یقین مولانا کی گھٹی میں
پڑا تھا لیکن درمیان میں تشکیل کا ایسا خارزار بھی ملا جو انھیں انکار تک
پہنچا گیا۔'' [1]

فلسفہ بڑا موضوع ہے اس کیلئے فنکار کو بہت غور و فکر کرنے کے بعد قلم اُٹھانا پڑتا ہے۔ فلسفے کے لئے ایک حساس ذہن کی ضرورت ہے۔ فلسفہ اور مذہب کے ایک اور اہم فرق کی طرف بھی مولانا نے اشارہ کیا ہے۔ اس کے متعلق پروفیسر یوسف سرمست لکھتے ہیں:

''وہ یہ کہ فلسفہ میں حرف آخر کوئی چیز نہیں ہوتی، ایک فلسفی ہی کے
کہنے کے مطابق فلسفہ کے نظریہ اور عقائد کی تکمیل بھی ایک فلسفیانہ
مفروضہ ہے۔ فلسفہ بضد ترقی کرتا ہے لیکن اس کے برخلاف مذہب
میں جہاں ضد پیدا ہوئی وہیں وہ ختم ہوا۔ اس کے پہلے حرف کو حرف
آخر ماننا ہوتا ہے جب ہی کہیں اس کے سایہ میں جگہ ملتی ہے اور ترقی
اور ارتقاء کا میدان ہاتھ آتا ہے۔ پھر یہ کہ فلسفہ کی تمام تر موشگافیاں
دنیا اور زندگی کو حلقہ دام خیال ثابت کرنے کیلئے صرف ہو جاتی
ہیں۔ اگر فلسفہ کی کوشش سے ایک پردہ ہٹتا ہے تو صرف یہ بات ظاہر
ہوتی ہے کہ سو پردے اور بھی اُس کے پیچھے پڑے ہیں۔'' [2]

مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریر کردہ کتاب ''غبار خاطر'' ہے۔ اصل میں یہ کتاب خطوط کا مجموعہ ہے

---

[1] ڈاکٹر یوسف سرمست، عرفان نظر، ۱۹۷۷ء، ص ۹۸

[2] ڈاکٹر یوسف سرمست، عرفان نظر، ۱۹۷۷ء، ص ۱۰۰۔۱۰۱

لیکن یہ اپنی چند خصوصیات کی وجہ سے صنف انشائیہ کے زمرے میں شمار ہوتی ہے۔انشائیہ میں کسی اہم یا غیر اہم واقعے، کسی خیال یا کسی جذبے کو پر لطف انداز میں پیش کرنا ہے۔

''غبار خاطر''میں شامل مضامین کو کچھ لوگ خطوط مانتے ہیں اور کچھ انشائیے۔مالک رام نے انھیں مضامین لکھا ہے۔یوسف انشائیے قرار دیتے ہیں چنانچہ اپنے اس خیال کو پیش کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> ''غبار خاطر'' دراصل ''داستانِ بے ستوں اور کوہکن'' سے شروع ہوتی ہے اور یہ نام نہاد خطوط (کم وبیش تمام تر) صنف انشائیہ سے تعلق رکھتے ہیں۔اگرچہ انھیں خطوط سمجھا جاتا ہے۔بات یہ ہے کہ اردو ادب میں بہت سی اصناف ایسی ہیں جن کا اور چھور معلوم نہیں ہے خواہ یہ اس مخصوص صنف کی کمی ہی کی وجہ سے کیوں نہ ہو۔یہ کمی اس قدر زیادہ ہے کہ ہمارے ذہنوں میں اس خاص صنف کے حدود کا دھندلا سا بھی نقشہ نہیں ہے۔بنا بریں انشائیہ مضمون اور مقالے سمجھ لیے جاتے ہیں اور کبھی مضمون اور مقالوں کو انشائیہ سمجھ لیا جاتا ہے۔چنانچہ ستم ظریفی یہ ہے کہ ہم انشائیوں کو خطوط کے زمرے میں شامل کر لیتے ہیں۔'' [1]

انشائیہ کو ذہن کی آزاد ترنگ کہا جاتا ہے۔جانسن نے اسے "Loose Sally of The Mind" کہا ہے۔کیوں کہ انشائیہ نگار کسی موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے خیالات کے بہاؤ میں کھو جاتا ہے اس لئے ان کے خیالات میں تسلسل باقی نہیں رہتا۔یوسف سرمست اس طرف اشارہ کرتے ہوئے غبار خاطر کے انشائیوں سے متعلق کہا کہ وہ اسی رنگ میں لکھے گئے ہیں چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> ''غبار خاطر کے تمام انشائیے اسی ''ترنگ'' میں آ کر لکھے گئے ہیں۔انشائیے شخصی جذبات اور احساسات کا آئینہ دار ہوتے ہیں۔

---

[1] ڈاکٹر یوسف سرمست، عرفان نظر، ۱۹۷۷ء، ص ۱۲۱

انشائیہ نگار کسی بھی موضوع پر لکھتے ہوئے اپنے خیالات اور احساسات میں اس طرح کھو جاتا ہے کہ ایک طرح کی ''لے'' قائم ہو جاتی ہے اور وہ خیال کے تسلسل کی رہنمائی میں نکل جاتا ہے اور ہر وہ بات جو اس سلسلے میں سوجھتی ہے بیان کر دیتا ہے ۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ کسی خاص اصول یا نظام کی پابندی نہیں ہو سکتی۔''[1]

نیاز فتح پوری اردو ادب میں افسانہ نگار، انشائیہ نگار اور مزاح نگار کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں۔ دراصل وہ رومانی اور جمالیاتی قلم کار ہیں ان کے افسانے ہو یا انشائیہ دونوں اپنے دلکش اسلوب کی وجہ سے اہمیت رکھتے ہیں۔ مزاح نگاری میں بھی انھیں کمال حاصل ہے۔ وہ قاری کو بے حد ہنساتے ہے۔

2.4 ۔ مزاح نگار

نیاز فتح پوری کی تحریروں میں لطافت اور رنگینی پائی جاتی ہے۔ وہ زندگی کے ہر پہلو کو اُجاگر کرتے ہیں اور اس کے حل کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ وہ دوسروں کی عیب جوئی نہیں کرتے ہیں وہ ہر وقت ہمدردی اور خلوص کے ساتھ ہیں۔ کسی بھی مسئلہ کو پیش کرتے ہیں۔ ان کی تحریروں کے توازن کی ستائش کرتے ہوئے پروفیسر یوسف سرمست لکھتے ہیں:

''نیاز بڑے ہوش و گوش رکھنے والے رند ہیں۔ ان کی تحریر کی لطافتیں زندگی کی رنگارنگی سے رنگین بنتی ہیں۔ وہ دل و دماغ دونوں کے دریچے کھلے رکھتے ہیں۔ وہ زندگی کے ہر رُخ کو دیکھتے ہیں۔ اسے محسوس کرتے ہیں اور پھر اس کا تجزیہ کرتے ہیں۔ اسے اپنے جذبات کی ترازو پر تولتے ہیں اور پھر فیصلہ صادر کرتے ہیں چونکہ ان سارے مراحل میں وہ نفسیاتی ژرف نگاہی سے کام لیتے ہیں

---

[1] ڈاکٹر یوسف سرمست، عرفان نظر، ۱۹۷۷ء، ص۔۱۲۳

اس لئے دوسروں کی کمزوری پر وہ جھلاتے نہیں بلکہ اس پر مسکرا دیتے ہیں چونکہ اس مسکراہٹ میں ہمدردی اور خلوص ہوتا ہے اس لئے ان کی اس خوش دلی میں سب ہی شریک ہو جاتے ہیں۔'' [1]

نیاز فتح پوری کی مزاح نگاری پر اپنے جن خیالات کو یوسف سرمست نے پیش کیا اس سے ان کے نظریہ کی بھی وضاحت ہوتی ہے۔ یعنی نیاز کے اعتدال انداز اور احساس وفکر کی یکساں شمولیت کو جس طرح انھوں نے بیان کیا ہے اس سے خود ان کے انداز تنقید کا بھی علم ہوتا ہے۔

یوسف سرمست نے مشہور مزاح نگار مجتبیٰ حسین کی مزاج نگاری پر بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ یوسف سرمست نے ان کی مزاح نگاری کی شہرت کا علاء الدین خلجی کی شہرت سے تقابل کرتے ہوئے مزاح نگاری کے میدان میں شمالی ہند و جنوبی ہند کا بے تاج بادشاہ قرار دیا ہے۔ مجتبیٰ حسین نے مزاحیہ مضامین کی شائستگی سے بھی بڑی تعداد میں خاکے لکھے ہیں اور اس کا دامن تھامے رکھا۔ اس لئے یوسف سرمست کے مطابق انہیں خاکہ نگاری کا بے تاج بادشاہ کہا جانا چاہئے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

علاء الدین خلجی اور مجتبیٰ حسین میں بڑی مماثلت ہے۔ خلجی نے بزور شمشیر دکن کو فتح کر لیا تھا اور مجتبیٰ نے بزور قلم شمالی ہند کو فتح کر لیا ہے۔ مگر مزاح نگاری کے اس بے تاج بادشاہ کا پایہ تخت دہلی بھی ہے اور حیدر آباد بھی۔ مزاح نگاری کی جگہ خاکہ نگاری کا انہیں بے تاج بادشاہ کہنا چاہئے۔ اس لئے کہ ہمارے اس خاکہ نگاری کی ''قلمرو'' جتنی وسیع ہے اتنی کسی بھی اردو کے خاکہ نگار کی نہیں ہے۔ مجتبیٰ نے کوئی چار یا پانچ سو خاکے اب تک لکھ دیئے ہیں اور ہر جگہ شائستگی کو قائم رکھا ہے۔'' [2]

---

[1] ڈاکٹر یوسف سرمست، عرفان نظر، ۱۹۷۷ء، ص۔ ۱۵۴

[2] ڈاکٹر یوسف سرمست، ادب کا نوبل انعام ادبی یا سیاسی اور دوسرے مضامین ۲۰۱۰ء ص۔ ۱۴۳

2.5 ۔مکتوب نگار

مرزا غالب کے خطوط نگاری میں بہت ساری موضوعات بھر دیتے ہیں۔تنگدستی، ناقدری، بیماری، دوستوں کی جدائی، غدر کی تباہ کاری وغیرہ۔ ہرطرح کا موضوع خطوط کیلئے وہ میسر رکھتے ہیں۔ایک خط میں لکھتے ہیں۔

''لوگ روٹی کھاتے ہیں، میں کپڑا کھاتا ہوں۔''

مرزا غالبؔ کی تحریروں میں ہرقسم کا فن نمایاں طور پر ظاہر ہوجاتا ہے۔ زندگی کی تبدیلی اور معاشرے کے اُتار چڑھاؤ کو دلکش انداز میں پیش کرتے ہیں۔احساسات، جذبات اور خیالات کو وہ منفرد انداز میں قاری کے سامنے خط کے ذریعہ پیش کرتے ہیں۔غالبؔ کے خطوطوں کے حوالوں سے پروفیسر یوسف سرمست نے یوں لکھا ہے:

> ''غالبؔ کے خطوط کا مطالعہ غائرنظر سے کیا جائے تو ان میں ناول کا ڈسکورس نمایاں ہوتا ہے۔زبان یا دوسرے الفاظ میں لسانی سانچہ ناول میں انتہائی صورت اختیار کرلیتا ہے۔اس میں اتنی گنجائش اور لچک پیدا ہوتی جاتی ہے کہ وہ ہرقسم کے خیالات ، احساسات اور جذبات ہی کونہیں بلکہ خارجی زندگی کے ہر واقعہ اور پہلو کو نمایاں کرسکے۔ غالبؔ کے خطوط میں ناول کی طرح داخلی اور خارجی زندگی کے ہر پہلو کا بیان ملتا ہے۔'' [1]

مرزا غالبؔ نے خطوط میں زندگی کی تصویر کشی کی ہے۔ چاہے غربت، افلاس، بھوک اور خودداری وغیرہ کو بے جھجک پیش کیا ہے۔ایک خط میں فرماتے ہیں کہ ''میرا حال مجھ سے کیا پوچھتے ہو۔دو چار دن میں پڑوسیوں سے پوچھ لینا'' غرض سماج کے ہر گوشے کو انھوں نے پیش کیا۔ان کے خطوط میں ناول کا اندازہ یا ناول کی کیفیت ملتی ہے۔جو موضوع ناول کا رہتا ہے وہ ان کے خطوط میں مل رہا ہے۔غالبؔ اور

[1] ڈاکٹر یوسف سرمست، تحقیق وتنقید، ۱۹۹۹ء، ص۔۸۷

اردوناول، پروفیسر یوسف سرمست نے یوں لکھا ہے:

''غالبؔ کے خطوط میں ناول کے سارے اجزا ملتے ہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ غالبؔ نے ناول کا Discourse شروع کیا اور قائم بھی کیا۔ یہ نئی اصطلاح زیادہ مانوس نہیں ہے لیکن بڑی معنویت رکھتی ہے۔ ادبی نظریے کے سلسلے میں یہ استعمال ہوتی ہے۔ اس کی معنوی افادیت کو دیکھ کر اسے اپنایا جاسکتا ہے۔ گوپی چند نارنگ نے اس کو ''مدلل بیان'' یا ''مبرہن بیان'' کیا ہے لیکن ڈسکورس کی معنویت مدلل بیان سے بالکل ظاہر نہیں ہوتی۔''[1]

فیض احمد فیضؔ کے خطوط کا مجموعہ ''صلیبیں مرے دریچے میں ہیں''۔ یہ مجموعہ ۱۹۷۴ء میں منظر عام پر آیا۔ اس میں کم و بیش ۱۵۰ خط ہیں جس میں زیادہ تر شریک حیات کے نام سے ہیں۔ ان خطوط پر اظہار خیال کرتے ہوئے یوسف سرمست نے بتانے کی کوشش کی ہے کہ ان خطوط کے ذریعے مکتوب نگار کی پوری شخصیت ہمارے سامنے عیاں ہوجاتی ہے۔ چنانچہ وہ اسی خصوصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''خطوط کے مجموعہ میں فیضؔ کی شخصیت کی مرجائیت اور حوصلہ مندی نمایاں ہوتی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اپنی بیوی کو حوصلہ مند رکھنے کے لئے وہ رجائیت کا نقاب اوڑھ لیتے ہیں بلکہ ان کی شخصیت ہی کا جوہر ہے جس کی گواہی ان کی پوری شاعری دیتی ہے۔ ان خطوط کو پڑھتے ہوئے فیضؔ کی پوری شاعری اپنی پوری چمک دمک کے ساتھ سامنے آجاتی ہے۔ فیضؔ کی نظم ''ملاقات'' بھی ان کی شخصیت کے اس رُخ کو پوری طرح نمایاں کرتی ہے۔ اس کی جیسی روشن ضمیری شاید ہی کسی دوسری اردو نظم میں مل سکے۔ فیضؔ کی رجائیت روشنی اور

---

[1] ڈاکٹر یوسف سرمست، تحقیق وتنقید، ۱۹۹۹ء، ص۔ ۸۶

سحر پر یقین کامل اس کے ہر ہر مصرعہ سے عیاں ہے۔اس میں لاکھ
مشعل بکف ستارے ملتے ہیں۔'' ۱

''صلیبیں میرے دریچے میں'' کی خصوصیات پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے انھوں نے فیضؔ کی شاعری اور زندگی کی تفسیر بتایا ہے۔ان کی زدگی کے مسائل ان کے خطوط کے ذریعے ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔اسی بات کوانھوں نے پنے مخصوص انداز میں سمجھایا ہے۔مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''صلیبیں مرے دریچے میں' نام ہے فیض کے خطوط کے مجموعہ کا۔ یہ نام جو بڑا فکر انگیز ہے کیونکہ یہ ان کی زندگی اور شاعری کی بہترین تفسیر بن گیا ہے۔فیضؔ چونکہ کوئے یار سے نکل کر سوئے دار گئے ہیں،اس لئے ان کی زندگی قدم قدم پر صلیبوں سے دوچار ہوتی ہے۔ ان کے دریچوں میں بھی صلیبیں گڑی رہی ہیں اور ان صلیبوں پر ابر بہار کو قربان کیا گیا ہے۔کبھی ان پر تابناک کا قتل ہوا ہے اور کسی پر بادصبا کو ہلاک کیا گیا ہے اور یوں خداوندگان مہر و جمال کا قتل ہوا ہے۔فیضؔ کی شاعری اور ان کی شخصیت کا ممتاز ترین وصف یہی ہے۔'' ۲

3۔محققین و ناقدین پر عملی تنقید

یوسف سرمست نے جن محققین و ناقدین پر عملی تنقید کی ہے ان میں گارساں، دتاسی، حالی اور کلیم الدین احمد کے نام اہمیت رکھتے ہیں۔

دکنی ادب میں تحقیق کے اتنے چراغ روشن ہو چکے ہیں کہ اس بات کا پتہ لگانا مشکل ہے کہ اس کا

---

۱ ڈاکٹر یوسف سرمست،ادب۔نقد حیات،۱۹۹۳ء،ص۔۱۱۰

۲ ڈاکٹر یوسف سرمست،ادب۔نقد حیات،۱۹۹۳ء،ص۔۹۷

پہلا چراغ کب اور کس نے روشن کیا تھا۔اس بارے میں بعض غلط فہمیاں بھی ملتی ہیں۔عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ بیسویں صدی میں یہ کام بابائے اردو مولوی عبدالحق نے سب سے پہلے شروع کیا۔ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ نے ایک مضمون ''قدیم اردو میں تحقیقی کام'' کے عنوان سے لکھا تھا۔ڈاکٹر زورؔ کی اس تحقیق سے اتفاق کرتے ہوئے دتاسی کی خدمت کو سراہتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بیسویں صدی سے بہت پہلے موجودہ تحقیق سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ گارساں دتاسی وہ پہلا شخص ہے جس نے دکنی ادب کی تحقیق سے گہری دلچسپی لی اور دکن کی کتابیں سب سے پہلے مرتب کر کے شائع کیں۔ دتاسی اردو زبان و ادب کا اتنا اور ایسا بڑا محقق ہے جس کا جواب دنیا بھر کے مستشرقین میں کہیں نہیں ملتا۔ دتاسی نے مجموعی طور پر اردو ادب کی اتنی زبردست اور ہمہ گیر خدمت کی ہے کہ اس کے اظہار کے لئے کئی کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔جس میں پہلے کتاب ڈاکٹر زورؔ کی ہے۔جس میں ڈاکٹر زورؔ نے صرف دتاسی کا ذکر ہی نہیں بلکہ اس عہد کے تمام اردو ادب پر کام کرنے والے مستشرقین کا تذکرہ کیا ہے۔''[1]

دتاسی نے تو اپنی ساری زندگی اردو ادب کی خدمت کیلئے وقف کر دی تھی۔ یوسف سرمست کے مطابق ان کے وہ کام جو غیر معمولی اہمیت اور وقعت رکھتے ہیں ان میں ''تاریخ ادبیات ہندوی اور ہندوستانی'' بھی قابل ذکر ہے۔ دکنی ادب کے سلسلے میں ان کی بڑی اہمیت ہے۔ یوسف سرمست نے دتاسی کو ایک محقق ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھا مدرس بھی بتایا ہے۔گارستاں دتاسی اپنے طالب علموں کو کس طرح پڑھاتے تھے۔اس حوالے سے پروفیسر یوسف سرمست لکھتے ہیں:

''دتاسی کو اس بات کا کامل شعور تھا کہ اردو کے ارتقائی مدارج کا

---

[1] ڈاکٹر یوسف سرمست،ادب۔نقد حیات،۱۹۹۳ء،ص۔۱۸۲

فرق دکنی اور شمالی ہند کی اردو میں پوری طرح نمایاں ہوتا ہے۔اسی لئے یہاں وہ شمالی ہند کے اردو کے نمونے اپنے طلباء کے سامنے پیش کرتا ہے۔ وہیں دکنی اردو کے نمونوں سے بھی انھیں واقف کرواتا ہے۔اسی وجہ سے وہ میر امن کی باغ و بہار کے ساتھ تحسین الدین کی ''کامروپ'' کو بھی پڑھاتا ہے۔''[1]

یوسف سرمست نے اردو محققین کے علاوہ تنقید نگاروں پر بھی تنقیدی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ خصوصاً حالؔی پر انھوں نے زیادہ لکھا ہے۔الطاف حسین حالؔی نے نظری اور عملی تنقید میں مقدمہ شعروشاعری لکھ کر خوب شہرت حاصل کی اور اردو تنقید کی بنیاد رکھنے کا سہرا بھی انھیں کے سر رکھا جاتا ہے۔ یوسف سرمست اپنی تحریروں میں اردو تنقید میں حالؔی کی اہمیت کے قائل نظر آتے ہیں اور انھیں کبھی اردو تنقید کا آدم تو کبھی اردو تنقید کا 'ارسطو' قرار دینے کو درست سمجھتے ہیں۔چنانچہ فرماتے ہیں:

''حالؔی کو اگر اردو تنقید کا آدم کہا جائے تو یہ بات قطعی طور پر بجا اور درست ہوگی۔ایسا نہیں ہے کہ حالؔی سے پہلے اردو میں تنقید کا نام و نشان نہیں تھا۔نام تھا لیکن برائے نام،نشان تھا لیکن جس کی نشان دہی مشکل تھی۔حالؔی سے پہلے اردو میں تنقید پر کوئی مستقل اور مربوط کتاب نہیں ملتی۔البتہ تنقید کے تعلق سے بکھرے ہوئے اور منتشر خیالات ضرور ملتے ہیں۔اگر ہم حالی کو اردو تنقید کا ارسطو کہیں تو یہ کچھ غلط نہ ہوگا۔'' [2]

اس کے بعد انھوں نے حالؔی پر اعتراضات کی وجوہات کے پیش نظر یہ کہا ہے کہ صرف مقدمہ شعرو شاعری کو رکھ کر ان پر اعتراض نہ کیا جائے۔اگر حالؔی کا بغور مطالعہ کیا جائے تو اس کے روشن دماغ کی کھلی

---

[1] ڈاکٹر یوسف سرمست،ادب۔نقد حیات،۱۹۹۳ء،ص۔۱۹۵

[2] ڈاکٹر یوسف سرمست،نظری اور عملی تنقید،دسمبر ۲۰۰۲ء،ص۔۱۴۱

مثال اس کی ''مقدمہ شعروشاعری ہے''۔اس کے علاوہ انھوں نے بہت ساری کتابیں لکھیں۔جن میں قابل ذکر ''یادگارِ غالبؔ'' اور ''حیات سعدیؒ'' ہیں۔ اردو ادب میں الطاف حسین حالیؔ کوئی چیزوں کا مخالف مانا گیا ہے۔ جیسے غزل کو وہ پسند نہیں کرتے تھے، اتنا ہی نہیں بلکہ اس کے خلاف تھے۔ان کی دیگر تصانیف یادگار غالبؔ اور حیات سعدیؒ کو بھی دیکھا جائے۔جس سے حالیؔ کے نقطۂ نظر کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔اس تعلق سے یوسف سرمست لکھتے ہیں:

> ''حالیؔ کو جزوی طور پر نہیں کلی طور پر دیکھنے کی ضرورت ہے۔ حالیؔ کو جو جزوی طور پر دیکھا جاتا ہے اس کی سب سے روشن اور کھلی مثال یہ ہے کہ جب ''مقدمہ شعر و شاعری'' پر بحث ہوتی ہے تو ''یادگار غالبؔ'' اور ''حیاتِ سعدیؒ'' کو بالکل فراموش کر دیا جاتا ہے۔ غزل کے بارے میں حالیؔ کے نقطۂ نظر کو ان دونوں کتابوں کو سامنے رکھے بغیر سمجھا ہی نہیں جاسکتا۔ حالیؔ کو غزل کا مخالف ''مقدمہ شعر و شاعری'' کی بعض باتوں کو سامنے رکھ کر قرار دیا جاتا ہے۔ یہ بات کہتے ہوئے کسی نے بھی اس حقیقت کو سامنے رکھنے کی تکلیف گوارا نہیں کی جو غالبؔ کا معترف ہو وہ غزل کا منکر کیونکر ہوسکتا ہے۔'' [1]

حالیؔ پر عملی تنقید کرتے وقت وہ نہ صرف لوگوں کے اعتراض کا جواب دیتے ہیں بلکہ وہ حالیؔ کی غیر معمولی تنقیدی بصیرت کے قائل بھی نظر آتے ہیں۔ کیوں کہ ان کے مطابق حالیؔ نے اردو تنقید میں جس طرح اپنے نظریات کو ایمانداری اور فکر انگیزی اور جامعیت کے ساتھ پیش کیا ہے۔اسی کی بنا پر وہ لوگوں کے اعتراضات کوئی نئی بات نہیں سمجھتے ہیں کیوں کہ بڑے ناقدین کے ساتھ اس طرح کی باتیں ہوتی ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> ''حالیؔ پر اعتراض کرنا اور ان سے اختلاف کرنا یا ان کے نقطہ نظر کی

---

[1] ڈاکٹر یوسف سرمست، ادب۔ نقد حیات، ۱۹۹۳ء، ص۔۲

مخالفت کرنا کوئی نئی بات نہیں ہے۔حالؔی ہمارے ایسے عظیم نقاد ہیں
جنھوں نے ادب اور شاعری کے بارے میں ایسی فکر انگیز باتیں
کہیں ہیں کہ یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہے گا کیونکہ انھوں نے بڑی
دیانت داری سے غیر معمولی تنقیدی بصیرت اور بصارت سے پوری
اردو شاعری اور اصناف سخن کا جائزہ لیا ہے۔اس کے ساتھ یہ تنقیدی
جائزہ بڑے اختصار لیکن حد درجہ جامعیت سے لیا گیا ہے''۔[1]

حالؔی پر جو اعتراضات یا نکتہ چینی ہوئی، ان میں سب سے بڑا نام کلیم الدین کا ہے۔وہ حالؔی پر سخت تنقید کرتے ہیں۔یہاں تک کہ وہ کہتے ہیں ان کا فہم و ادراک معمولی ہے۔اس بات سے یوسف سرمست کو سخت اختلاف ہے کیوں کہ کلیم الدین احمد نے اس بات سے اتفاق کیا تھا کہ ''حالی اردو تنقید کے بانی ہیں اور اس وقت تک کے بہترین نقاد''۔پھر اس کے بعد ان کی باتیں خود ان کو رد کرتی ہیں۔پھر انھوں نے یہ حوالہ بھی دیا کہ حالؔی سے انھوں نے جس مسئلہ میں اختلاف کیا وہ باتیں حالؔی نے کلیم الدین احمد اور ملٹن کے حوالے سے کہیں ہیں۔کلیم الدین کے ان اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے یوسف سرمست تلخ لہجے میں فرماتے ہیں:

''کلیم الدین احمد کے 'فرمودات' پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے کیوں
کہ انھوں نے حالؔی پر بہت ہی سخت اعتراض کیا ہے۔وہ حالؔی کے
بارے میں لکھتے ہیں ''خیالات ماخوذ، واقفیت محدود، نظر سطحی، فہم و
ادراک معمولی، غور و فکر ناکافی، تمیز ادنیٰ، دماغ و شخصیت اوسط یہ تھی
حالؔی کی کل کائنات''۔پہلی بات تو یہ کہ حالؔی کے بارے میں سب
کچھ کہنے کے بعد یہ کہنا کہ ''حالؔی اردو تنقید کے بانی بھی ہیں اور اس
وقت تک اردو کے بہترین نقاد'' یہ جملے خود پہلے انھوں نے جو کچھ کہا

---

[1] ڈاکٹر یوسف سرمست، ادب۔نقد حیات، ۱۹۹۳ء، ص۔۹

اس کی تردید کرنے کیلیئے کافی ہیں۔رہی یہ بات کہ حالؔی کے خیالات
ماخوذ ہیں اس بات پر سب ہی متفق ہیں کہ حالؔی نے بعض باتیں
خاص طور پر سادگی، اصلیت اور جوش کے بارے میں کہیں گو انھوں
نے ملٹن کا حوالہ دیا ہے لیکن اپنے طور پر ان کی تشریح اور ترجمانی کی
ہے۔انھوں نے کلیم الدین احمد کی طرح کہیں سے خیالات چرا کے
یا اُڑا کے اپنے نام سے پیش نہیں کیئے ہیں۔''[1]

غرض جن ناقدین نے حالؔی پر اعتراضات کیئے ہیں۔یوسف سرمست نے ان سے اختلاف کیا ہے اور اپنے دلائل بھی پیش کر کے ان اختلافات کے جوابات بھی دیئے ہیں۔

4 اصناف ادب پر عملی تنقید

پروفیسر یوسف سرمست نے نہ صرف اردو شعراء، ادیبوں اور ناقدین ادب پر اپنی تنقیدی آراء کا اظہار کیا بلکہ ادب کی مختلف اصناف پر بھی تنقیدی آراء پیش کی ہیں۔

4.1۔ناول

صنف ناول پر یوسف سرمست نے عملی تنقید کی ہے۔اس سلسلے میں بیسویں صدی میں اردو ناول خصوصیت کے ساتھ اہمیت رکھتی ہے۔اردو میں ناول چوں کہ انگریزی ادب سے اردو میں آیا ہے اس لئے اردو میں ناول کی ابتداء اور اس کے رواج پانے کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا ہے۔ان کے مطابق ناول کے ذریعہ ہر قسم کے موضوعات پر آزادانہ طور پر اظہار خیال کیا جاسکتا ہے۔اس کے ذریعہ زندگی کے مختلف تجربات اور زندگی کی نئی آگہی کو پوری تکمیل کے ساتھ پیش کیا جاسکتا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ اردو میں ناول انگریزی ادب سے آیا ہے اور انگریزی زبان کے ناولوں کا اردو میں ترجمہ کیا گیا ہے۔اس طرح اردو میں انگریزی ناولوں کا رواج عام ہوگیا۔ان کے مطابق انگریزی ناول کا پہلا پورا ترجمہ ۱۸۸۵ء میں

---

[1] ڈاکٹر یوسف سرمست، نظری اور عملی تنقید، دسمبر ۲۰۰۲ء، ص۔۱۶۸

ہوا۔ ''ویکار آف دی ویکفیلڈ'' کا ترجمہ عبدالرحمٰن نے اردو میں کیا۔ ان کے خیال میں مغربی مطالعے سے یہاں کے ناول نگاروں میں پختہ شعور کا عکس ملتا ہے۔ ناول میں اہم تبدیلیاں لانے والے محرکات کا تفصیل سے جائزہ لینے کے بعد یوسف سرمست نے اس عہد کے اردو ناول نگاروں کے یہاں پختہ شعور کی نشاندہی کی ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''انگریزی ناولوں کے مطالعہ کا رواج زیادہ عام ہوگیا۔ راست طور سے بھی اردو ترجموں کے ذریعہ بھی۔ اس لئے اس عہد کے ناول نگاروں کے یہاں ناول نگاری کا ایک گہرا اور پختہ شعور ملتا ہے اور وہ اس کی اہمیت کو محسوس کر کے شعوری طور پر اس سے کام لیتے ہیں۔ شررؔ کو یہ احساس کہ وہ فنی قوموں کی زندگی پلٹ سکتا ہے۔'' [1]

یوسف سرمست نے اردو ناول کے آغاز اور اس عہد کے ناول نگاروں کے شعور اور فن پر روشنی ڈالنے کے علاوہ ناول کی اقسام پر بھی بحث کی ہے۔ انھوں نے نفسیاتی ناولوں سے متعلق بتاتے ہوئے کہا کہ ذہنی فضاء کی پیش کشی نفسیاتی ناولوں کا اہم مسئلہ ہوتا ہے۔ نفسیاتی ناول میں کن چیزوں کو ملحوظ رکھنا ضروری ہوتا ہے اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے پروفیسر یوسف سرمست لکھتے ہیں:

''نفسیاتی ناولوں میں ''گفتار کے اسلوب'' پر قابو بھی رکھنا ہوتا ہے اور خیالات کے تلاطم کو بھی پیش کرنے کے لئے انھیں اسلوب کے سانچے میں ڈھالنا ہوتا ہے لیکن جب خیالات کو اسلوب کے سانچے میں ڈھالا جاتا ہے تو وہ اپنی اصلی شکل میں نہیں رہتے وہ سیال حالت میں نہیں رہتے بلکہ منجمد ہوجاتے ہیں۔ اس طرح ذہنی فضا اور داخلی زندگی کو پیش کرنا بڑا کٹھن بن جاتا ہے۔'' [2]

---

[1] ڈاکٹر یوسف سرمست، بیسویں صدی میں اردو ناول، تیسرا ایڈیشن ۲۰۱۶ء، ص ۵۷

[2] ڈاکٹر یوسف سرمست، عرفان نظر، ۱۹۷۷ء، ص۔ ۱۷۹-۱۸۰

انھوں نے موضوعی ناول پر بھی بحث کی ہے۔ ان کے مطابق موضوعی ناول اس ناول کو کہتے ہیں جس میں نفسی، خیالی یا داخلی ہیئت کو موضوع بنایا گیا ہو اس کی کوئی قید نہیں ہوتی ہے، یہ اصطلاح بھی انگریزی ادب سے مستعار لی گئی ہے۔ انھوں نے نفسیاتی ناولوں میں زاویہ نگاہ کی اہمیت کیوں ہوتی ہے اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

''موضوعی ناول نگاری کے ابتدائی نقوش ولیم جیمس کے چھوٹے بھائی اور انگریزی کے مشہور ناول نگار ہنری جیمس کے ہاں ملتے ہیں۔ اس نے ناول میں زاویہ نگاہ کی اہمیت کو ظاہر کیا۔ نفسیاتی ناولوں میں زاویہ نگاہ کی اس لئے بیحد اہمیت ہوتی ہے کہ ناول نگار کرداروں کی ذہنی فضاء تک قاری کو لے جانا چاہتا ہے اور جب تک قاری اس کردار کے مخصوص زاویہ نگاہ کو نہیں پا لیتا اس وقت تک وہ کردار کے ذہن کو نہیں سمجھ سکتا۔'' [1]

انھوں نے آگے سماجی ناول کی تعریف کرتے ہوئے بتایا کہ سماجی ناول وہ ناول ہے جس میں سماج کے ساتھ جڑے مسائل کو پیش کیا جائے۔ تا کہ روزمرہ کے واقعات وحادثات یا ہنگامہ آرائی کو بہ آسانی پیش کیا جائے لیکن فن کی کسوٹی کا خیال رکھ کر انھیں تحریر کرنا ضروری خیال کیا ہے۔ سماجی ناول کے لئے کن شرائط کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے اس پر پروفیسر یوسف سرمست بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سماجی ناول کے لئے پہلی اور آخری شرط یہ ہے کہ وہ روزمرہ زندگی میں پیش آنے والے سماجی واقعات کو پیش کرے۔ روزمرہ کی سماجی زندگی کو پیش کرتے وقت سماجی ناول کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ ناول کے تمام عناصر ترکیبی میں اثر کو ملحوظ رکھے۔ ناول کے عناصر ترکیبی میں قصہ، پلاٹ، کردار نگاری، ماحول، مکالمے، جذبات نگاری،

---

[1] ڈاکٹر یوسف سرمست، عرفان نظر، ۱۹۷۷ء، ص۔۱۷۴

فلسفہ، حیات اور اسلوب بیان شامل ہیں۔ سماجی ناول نگاری اسی وقت تکمیل کو پہنچ سکتی ہے جب کہ ناول کے متذکرہ بالا تمام عناصر پر روزمرہ کی زندگی کی چھاپ ہو اور وہ ہماری حقیقی زندگی یا دوسرے الفاظ میں انسان کے سماجی مسائل کو پیش کرنے کی کوشش کرے۔''[1]

سماجی ناولوں کی درجہ بندی کن ناولوں تک رہ سکتی ہے اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے انھوں نے بتایا ہے کہ جن ناولوں میں تاریخ بھی ہو اور سماج کی عکاسی بھی ہو ان کا زمرہ کیا ہوگا اپنے ان خیالات کو پیش کرتے ہوئے انھوں نے سماجی زندگی کے مسئلہ کو ناول میں پیش کرنے کو ضروری خیال کیا ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''سماجی ناول کا اطلاق کن ناولوں پر ہو سکتا ہے اور کن پر نہیں ۔ یہ ایک دلچسپ سوال کی صورت میں ان ناولوں کے سلسلے میں سامنے آتا ہے جن میں تاریخی حالات کو پس منظر بنایا گیا ہے ایسے ناول بیک وقت تاریخی بھی ہوتے ہیں اور سماجی بھی ۔ یہاں یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہئے کہ کوئی بھی ناول اس وقت تک عظیم ناول نہیں بن سکتا نہ بنا ہے جب تک کہ وہ کسی نہ کسی سماجی زندگی کے مسئلہ کو نہ پیش کرے۔'' [2]

آگے انھوں نے سوانحی ناول پر بھی بحث کی ہے۔ ان کے مطابق سوانحی ناول کی حد صرف زندگی تک ہی محدود ہوتی ہے لیکن وہ بھی سوال کرتے ہیں کسی شخص کے حیالات کے وقت ناول لکھی جائے یا ان کے فوت ہونے کے بعد۔ لیکن دونوں صورتوں میں ناول لکھی جائے گی۔ سوانحی ناول کی ابتداء اردو میں کس نے کی ہے اس کا تذکرہ کرتے ہوئے پروفیسر یوسف سرمست نے لکھا ہے:

---

[1] ڈاکٹر یوسف سرمست، عرفان نظر، ۱۹۷۷ء، ص۔۱۵۷

[2] ڈاکٹر یوسف سرمست، عرفان نظر، ۱۹۷۷ء، ص۔۱۵۹

''اردو ادب میں ''کارِ جہاں دراز ہے'' ایک اہم اور بہت ہی بڑا تجربہ ہے۔ انھوں نے اسے ''سوانحی ناول'' لکھا ہے۔ اصطلاح کافی پرانی ہے۔ ایسے تمام ناول جس میں کسی کردار کی آپ بیتی بیان ہوتی ہے سوانحی ناول یا Auto Biographical Novel خود اردو میں شاید رسوؔا نے سب سے پہلے سوانح عمری کے طور پر لکھنے کی کوشش کی ہے۔'' [۲]

4.2 ۔ افسانہ

افسانے کے فن پر بحث کرتے ہوئے یوسف سرمست نے فن یا Art کی تعریف یوں پیش کی ہے:

''انگریزی میں فن کے لئے "Art" لفظ استعمال کیا جاتا ہے اور کاریگری کے لئے "Craft" کا لفظ۔ فن حقیقت میں کاریگری ہی ہوتی ہے لیکن اعلیٰ ترین کاریگری کو فن کہا جاتا ہے......فنکاری کا ہر نمونہ نایاب اور گراں مایہ ہوتا ہے۔ فنکاری کے نمونے بار بار نہیں بنتے۔ تاج محل دوبارہ نہیں بنایا جاسکتا۔ مونالیزا کی تصویر پھر نہیں بن سکتی۔'' [۲]

افسانے میں نفسیاتی تجزیہ کو یوسف سرمست ضروری خیال کرتے ہیں کیوں کہ اس کی وجہ سے قاری پر گہرا تاثر پڑتا ہے۔ چنانچہ افسانے میں نفسیاتی تجزیہ کا مطلب یوسف سرمست کے نزدیک تحلیل نفسی کر کے کرنا نہیں ہے بلکہ وہ افسانے میں واقعات اور کرداروں کے ایسے بیان کو نفسیاتی تجزیہ مانتے ہیں۔ جہاں نفسیاتی محرکات کی طرف ہمارا ذہن منتقل ہو۔ چنانچہ ادب میں نفسیاتی بصیرت کی اہمیت بتاتے ہوئے وہ افسانے کے لئے نفسیاتی تجزیہ کو ضروری خیال کرتے ہیں، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

---

[۱] ڈاکٹر یوسف سرمست، عرفان نظر، ۱۹۷۷ء، ص۔ ۳۶

[۲] ڈاکٹر یوسف سرمست، اردو افسانہ نگاری میں کرشن چندر کی انفرادیت، ۲۰۱۲ء، ص ۱۳

''ادب نفسیاتی بصیرت ہی سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے کیونکہ یہ نفسیاتی بصیرت ہی ہوتی ہے جس کی وجہ سے فنکار اپنے قاری کو متاثر کرسکتا ہے اور کرتا ہے۔ کسی بھی افسانے کا سارا تاثر کسی بھی واقعے کو نفسیاتی طور پر پیش کرنے پر منحصر ہوتا ہے۔ جب تک کہ افسانے میں نفسیاتی تجزیہ نہ ہو۔ افسانہ کا تاثر شدید نہیں ہوتا۔ نفسیاتی تجزیے سے مراد یہاں تحلیل نفسی نہیں ہے بلکہ واقعات اور کرداروں کا ایسا بیان ہے جس سے نفسیاتی محرکات کی طرف ذہن منتقل ہو۔ تحلیل نفسی کرنا ادب کا کام نہیں ہے یہ تو ماہر نفسیات کا منصب ہے۔ ادیب اور شاعر نفسیات کے عمیق ترین مسائل کو بھی بیان کر جاتا ہے اور لاشعور کی کیفیات کو بھی لیکن وہ یہ سب کچھ داخلی انداز میں کرتا ہے۔''[1]

اردو ادب میں ہزار داستان یا الف لیلیٰ کی بہت سی کہانیوں کو الگ کر کے شائع کیا گیا ہے۔ جیسے ''علی بابا چالیس چور''، ''سند باد جہازی''، ''الہ دین کا چراغ''۔ یہ کہانیاں اپنی جگہ مکمل ہیں۔ ان کہانیوں میں مختصر افسانے کے اولین آثار یوسف سرمست کے نزدیک باضابطہ طور پر اردو افسانے میں سجاد حیدر یلدرم کے یہاں ملتے ہیں۔ اردو میں افسانہ کی روایت پر روشنی ڈالتے ہوئے یلدرم کے پہلے افسانے کی اولیت کو تسلیم تو کیا لیکن پریم چند کی عظمت کے وہ قائل نظر آتے ہیں چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''اردو کے اولین افسانہ نگار سجاد حیدر یلدرم اور پریم چند ہیں۔ فرمان فتح پوری کی تحقیق کے مطابق پریم چند کا افسانہ ''دنیا کا انمول رتن'' دیا نارائن نگم کے رسالے ''زمانہ'' میں ۱۹۰۷ء میں شائع ہوا۔ یلدرم کا پہلا افسانہ ''نشہ کی پہلی ترنگ'' پریم چند کے افسانے سے

---

[1] ڈاکٹر یوسف سرمست، ادب۔ نقد حیات، ۱۹۹۳ء، ص۔ ۸۸

سات سال پہلے یعنی ۱۹۰۰ء رسالے ''معارف''علی گڑھ شائع ہوا۔
(اردو افسانہ اور افسانہ نگار ۱۴) گو یلدرم کو تقدم حاصل ہے لیکن ان
کی افسانہ نگاری کا اثر کافی محدود تھا اس کے برخلاف پریم چند نے
اردو افسانے کا دامن بہت وسیع کیا۔انھوں نے کوئی تین سو افسانے
لکھے جو آنے والی نسلوں کے لئے مشعل راہ ہیں۔ پریم چند کا اثر
بہت زیادہ وسیع، ہمہ گیر اور گہرا ہے۔''[1]

افسانے میں حقیقت نگاری کے جز سے متعلق سو یسور کے نظریات سے اتفاق کرتے ہوئے افسانے میں اشیاء کی حقیقت کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں۔مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''حقیقت کی اضافت ہی سے افسانے کا تعین ہوتا ہے۔اس میں
شک نہیں کہ سو یسور کے نظریات بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ وہ جس
طرح حقیقت کو زبان کا جز و سمجھتا ہے۔اس میں بڑی حد تک سچائی
ہے لیکن ان تمام فلسفیانہ موشگافیوں کے باوجود حقیقت اپنا علٰحدہ
وجود رکھتی ہے۔حقیقت کا ادراک گو زبان سے وابستہ ہے لیکن مقدم
تو اشیاء کی حقیقت ہے۔''[2]

4.3 ۔ انشائیہ

انشائیہ نگاری کی صنف اردو میں انگریزی ادب سے آئی ہے۔انگریزی میں (Light Essay) کہتے ہیں۔ عام طور پر اردو کے اخباروں اور رسالوں میں کسی خاص موضوع پر صحافتی علمی انداز کے جو مضامین یا مقالے لکھے جاتے ہیں، انشائیہ ان سے مخالف ہوتا ہے۔انشائیہ میں بے تکلف بے ساختہ اور ہیئت غیر علمی انداز میں کہی جاتی ہے۔انشائیہ میں موضوع اور ہیئت کی بحث کرتے ہوئے انشائیہ نگار کی

---

[1] ڈاکٹر یوسف سرمست، اردو افسانہ نگاری میں کرشن چندر کی انفرادیت، ۲۰۱۲ء، ص۔۱۸۔۱۹

[2] ڈاکٹر یوسف سرمست، تحقیق و تنقید، ۱۹۹۹ء، ص۔۳۳

شخصیت اوراس کے خیالات سے متعلق یوسف سرمست لکھتے ہیں:

''انشائیہ میں مواد اور ہیئت دونوں پر شخصیت کی چھاپ ہوتی ہے اور شخصیت کی یہ جلوہ گری انشائیہ کو مقبول ہی نہیں محبوب بھی بنا دیتی ہے۔ انشائیہ شخصی جذبات و احساسات اور ذاتی تجربات و مشاہدات کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ انشائیہ نگار جب کسی چیز سے متاثر ہوتا ہے تو اس کے خیالات کی رو بہہ نکلتی ہے لیکن جس طرح دریا کے بہاؤ اور روانی کے لئے مخصوص راستہ متعین نہیں کیا جاسکتا، اسی طرح انشائیہ نگار کے خیالات کو اصولوں اور پابندیوں کی زنجیر نہیں پہنائی جاسکتی۔ انشائیہ میں خیالات کے بہاؤ کی وجہ سے ایک طرح کی لے اور ایک آہنگ پیدا ہو جاتا ہے۔'' [1]

یوسف سرمست کے مطابق جس طرح شاعری اور آپ بیتی میں مصنف قاری سے قریب ہوتا ہے اسی طرح انشائیہ میں بھی انشائیہ نگاہ ایک دوست کی طرح قاری سے قربت اختیار کرتا ہے۔ اپنے انہیں خیالات کا اظہار کرتے ہوئے یوسف سرمست انشائیہ کے دیگر پہلوؤں پر یوں روشنی ڈالی ہے۔ مثلاً:

''انشائیہ میں بھی شاعری اور آپ بیتی کی طرح مصنف اور قاری ایک دوسرے کے قریب آجاتے ہیں۔ انشائیہ نگار ناصح یا واعظ نہیں ہوتا۔ مخلص دوست ہوتا ہے۔ وہ کوئی بات سمجھاتا نہیں سمجھا دیتا ہے۔ انشائیہ میں ''مقدس'' سنجیدگی بھی ''شیریں دیوانگی'' کا لبادہ اوڑھے سامنے آتی ہے۔ انشائیہ میں مسلسل اور مربوط انداز میں کسی مسئلہ پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ نہ تشریح کی جاتی ہے۔ انشائیہ نگار کھل کر تو بات کرتا ہے لیکن بات کو کھول کر کہنا اس کا کام نہیں، انشائیہ

[1] ڈاکٹر یوسف سرمست، عرفان نظر، ۱۹۷۷ء، ص۔۱۱۲

میں اشاروں اشاروں میں ہی سب کچھ کہہ دیا جاتا ہے۔'' ا؎

انشائیہ سنجیدگی کا متحمل نہیں ہوتا بلکہ شگفتگی اور لطافت اس کی اہم خصوصیت ہے لیکن یوسف سرمست کا کہنا ہے کہ اُس میں جو فلسفہ حکمت اور سائنس جیسے موضوعات پر بھی بحث ہوتی ہے جس کی وجہ سے سنجیدگی بھی در آ سکتی ہے لیکن یہ انشائیہ نگار کا وصف ہوتا ہے کہ وہ اپنے دلی تاثرات کا بیان اس طرح کرے کہ وہ مضامین مشکل نہ لگے چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

''انشائیہ کا اسلوب اگرچہ شگفتہ، سلیس، سادہ اور نرم و نازک ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود انشائیہ میں فلسفہ، حکمت اور سائنس جیسے موضوعات بھی زیر بحث آ جاتے ہیں لیکن انشائیہ نگار کا مقصد ان کی گہرائیوں میں جا کر ان کی تشریح کرنا نہیں ہوتا۔ ہاں، سلسلہ بیان میں دلی تاثرات کو ظاہر کرنے کے لئے وہاں سے مدد ضرور لیتا ہے۔'' ۲؎

4.4 ۔ خاکہ

خاکہ اور سوانح میں بنیادی فرق طوالت اور اختیار کا ہوتا ہے اس کے علاوہ سوانح میں شخصیت کے کارناموں اور اس کی زندگی کو تفصیلات کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے جبکہ خاکہ میں موضوع خاکہ کی شخصیت پر پوری توجہ کی جاتی ہے۔ اسی فرق کی وضاحت کرتے ہوئے یوسف سرمت نے ان کے مقاصد کو اچھی طرح سمجھانے کی کوشش کی ہے:

''خاکہ نگاری کی تمام تر توجہ شخصیت پر ہوتی ہے۔ وہ شخصیت کے منفرد پہلوؤں کو جو اس کے مشاہدہ اور تجربے میں آتی ہیں ان کو پیش کرتا چلا جاتا ہے۔ خاکہ نگار کو کسی شخصیت کے کارناموں کی وجہ سے

ا؎ ڈاکٹر یوسف سرمست، عرفان نظر، ۱۹۷۷ء، ص۔۱۱۳

۲؎ ڈاکٹر یوسف سرمست، عرفان نظر، ۱۹۷۷ء، ص۔۱۱۵

متاثر ہوتا ہے لیکن نہ تو اس کا مقصد کارناموں کو بیان کرنا ہوتا ہے نہ اس کی زندگی کی تفصیلات کو پیش کرنا ہوتا ہے۔ خاکہ نگار نہ تو شخصیت کی حسب نسب کو پیش کرتا ہے نہ تعلیم وترتیب کو بیان کرتا ہے۔''[1]

صنف خاکہ پر یوسف سرمست نے بڑی اچھی بحث کی ہے اور اس کی خصوصیات کا سیر حاصل جائزہ بھی لیا ہے رشید احمد صدیقی کے خاکوں کے حوالے سے وہ خاکہ میں موضوعات اور اسلوب بیان کی شادابی کا تذکرہ یوں کرتے ہیں:

''خاکہ ذاتی اور انفرادی تجربات و مشاہدات اور ان سے حاصل ہونے والی دانائی اور بینائی کی جلوہ گاہ ہوتا ہے۔ اس لئے خاکہ نگار کے پاس شخصیات کی کمی نہیں ہوتی۔ وہ چپراسی سے لیکر صدر جمہوریہ تک کسی کو بھی موضوع بنا سکتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ اس شخص سے حقیقتاً متاثر بھی ہوا ہو کیونکہ یہ تاثر اور بھی بیان کی خوش خرامی ایسے گل تر تک جاتی ہے جو ہمیشہ شاداب رہتے ہیں۔ رشید احمد کے تمام خاکوں میں ایسی شادابی ملتی ہے اور یہ خاکے آج اردو کے بہترین خاموں میں شمار ہوتے ہیں۔'' [2]

4.5 ۔ خودنوشت

پروفیسر یوسف سرمست نے نہ صرف انشائیہ اور خاکے کی صنف پر سیر حاصل بحث کی ہے بلکہ صنف خودنوشت پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ خودنوشت یا آپ بیتی کو وہ بیانیہ کی ایک صنف مانتے ہیں یہی وجہ ہے کہ بیانیہ کیسے ہوتا ہے اور کیسے آگے بڑھتا ہے اس پر روشنی ڈالتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''خودنوشت یا آپ بیتی۔ بیانیہ ہی کی ایک قسم ہے۔ بیانیہ کی بعض

---

[1] ڈاکٹر یوسف سرمست، ادب کا نوبل انعام ادبی یا سیاسی اور دوسرے مضامین ۲۰۱۰ء ،ص۔ ۲۸

[2] ڈاکٹر یوسف سرمست، ادب کا نوبل انعام ادبی یا سیاسی اور دوسرے مضامین ۲۰۱۰ء ،ص۔ ۳۰

اہم خصوصیات ہوتی ہیں۔ بیانیہ کی ساخت و پرداخت ہوتی ہے۔
ایک منصوبہ کے تحت واقعات کا ایک تسلسل ہوتا ہے۔ بیانیہ میں
بہت سے ایسے اجزاء ملتے ہیں جس کو ہم سن چکے ہیں یا دیکھ چکے
ہیں۔ بیانیہ ایک خاص سمت میں حرکت کرتا ہے یا آگے بڑھتا ہے۔
ایک خاص انداز میں اس کا ارتقاء ہوتا ہے۔'' [1]

انھوں نے آگے جوشؔ ملیح آبادی کی خودنوشت کی مثال پیش کرتے ہوئے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ بیانیہ کو احتیاط سے نہ برتا گیا تو خودنوشت کو صنف افسانہ بنانے میں دیر نہیں لگتی۔ اس لئے اس میں احتیاط کی ضرورت ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''جوشؔ کی یہ خودنوشت اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ افسانے اور
آپ بیتی کی سرحدیں کس طرح سے مل جاتی ہیں۔ یہ دونوں اصناف
ایک دوسرے سے بعض وقت اتنی قریب ہو جاتی ہے کہ خود آپ بیتی
کا الگ صنف کی حیثیت سے وجود خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ بعض
خودنوشت نگار تو اس بات کا صاف طور پر اعلان کرتے ہیں جیسا
میری میکارتھی نے اپنی خودنوشت میں کہا ہے کہ ہر آپ بیتی خواہ کیسی
ہی حقیقت پر مبنی ہو لازمی طور پر ایک بیانیہ کی تخلیق کرتی ہے۔'' [2]

4.6 ۔مکتوب نگاری

خطوط نگاری قدیم زمانے میں ایک دوسرے سے ربط کا بہترین ذریعہ تھی۔ موجودہ دور میں یہ ناپید ہے۔ یوسف سرمست نے اصناف ادب پر تنقید کرتے وقت صنف مکتوب نگاری پر بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ خطوط نگاری کے فن پر روشنی ڈالتے ہوئے مکتوب نگار کی اہم صفات کی طرف بھی اشارہ کیا

---

[1] ڈاکٹر یوسف سرمست، ادب کا نوبل انعام ادبی یا سیاسی اور دوسرے مضامین ۲۰۱۰ء ص۔۳۱

[2] ڈاکٹر یوسف سرمست، ادب کا نوبل انعام ادبی یا سیاسی اور دوسرے مضامین ۲۰۱۰ء ص۔۳۴

ہے۔مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''اصل میں خط نگاری اپنی ذات پر پڑے ہوئے پردوں کو ہٹانے کا فن ہے۔بہترین خطوط وہی لکھ سکتے ہیں جو مصلحتوں کو خاطر میں لائے بغیر اپنی شکست کا بے جھجک اظہار کرتے ہیں۔ یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ شخصیت میں ایک رندانہ شان اور سرمستی نہ ہو۔بہترین خطوط لکھنے کے لئے شخصیت کے رندانہ بانکپن کے ساتھ زندگی اور کاروباری زندگی کے تعلق سے ایک فلسفیانہ نقطۂ نظر بھی لازمی ہے۔'' [1]

4.7 ۔ تبصرہ نگاری

اردو نثر میں کسی کتاب، رسالہ یا کسی بھی وجود کو دیکھنے کے باوجود جو تاثرات کا اظہار کیا جاتا ہے اور اس کے محاسن و معائب کو تحریری شکل میں پیش کیا جاتا ہے وہ تبصرہ کہلاتا ہے۔ یوسف سرمست تبصرہ کے مادہ اور لفظی معنی کو بڑی صراحت سے سمجھاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''تبصرہ جیسا کہ اس لفظ کی معنویت سے ظاہر ہے۔کسی چیز کو دیکھنا ہے۔اس کا مادہ عربی کا سہ حرفی لفظ بصر ہے۔بصر کے معنی بینائی یا آنکھ کے ہیں۔ ہر عربی سہ حرفی مادے سے کئی الفاظ بناتے ہیں۔ اسی طرح بصر سے باصر، باصر سے بصارت، بصیرت، بصائر، تبصرہ، مبصر اور تبصرہ بنے ہیں۔تبصرے کے لفظی معنیٰ ہیں بینا کرنا ، سمجھنا۔'' [2]

یوسف سرمست کی تنقید کی اہم خصوصیت وضاحت وصراحت ہے وہ کسی بھی موضوع پر بحث کرتے

---

[1] ڈاکٹر یوسف سرمست،ادب۔نقد حیات،۱۹۹۳ء،ص۔۹۹

[2] ڈاکٹر یوسف سرمست،ادب۔نقد حیات،۱۹۹۳ء،ص۔۱۶۸

وقت بڑی وضاحت سے انھیں سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً تبصرہ اور تنقید کے فرق کو واضح کرتے ہوئے انھوں نے بڑی عمدگی سے دونوں کے درمیانی فرق کو سمجھایا ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:

’’تبصرہ اور تنقید میں یہی فرق ہے کہ تبصرہ نگار صرف ہیرے کی نشاندہی کرتا ہے، تنقید نگار اس کا حجم، اس کا رنگ اور اس کی تراش خراش دیکھ کر اس کا درجہ متعین کرتا ہے۔ اس کی قدر و قیمت کی وضاحت کرتا ہے۔ تبصرہ نگار کا کام ابتدائی ہوتا ہے جبکہ تنقید نگار کا کام انتہائی۔‘‘ [۱]

5۔اردو ادب کی تحریکوں پر عملی تنقید

یوسف سرمست نے نہ صرف شعراء ادیبوں اور اصناف ادب پر عملی تنقید کی ہے بلکہ اردو ادب کی بعض اہم تحریک کے حوالے سے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ خصوصاً مختلف ادیبوں اور ناقدین کے حوالے سے اردو ادب کی ان تحریکوں کی خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے۔

5.1 ۔ ترقی پسند تحریک

ترقی پسند مصنفین کے قیام کے درمیان ہندوستانی ادب نے واضح طور پر سمت حاصل کی اور اس میں زبردست تبدیلی آنے لگیں۔ ادیبوں کے انداز فکر بدلنے لگے۔ ادیب کا مقصد تفنن طبع نہ رہ گیا بلکہ اس نے عصری تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش شروع کی ہے جس میں اردو ناول نگاروں نے نمایاں طور پر حصہ لیا ہے۔ ترقی پسند تحریک کی انہیں خصوصیات کی وجہ سے یوسف سرمست اس تحریک کو اہم مانتے ہیں۔ چنانچہ مجموعی اعتبار سے اس تحریک کی خدمات کو سراہتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

’’بہر حال ترقی پسند تحریک نے مجموعی اعتبار سے اردو ادب کی روش بدل دی اور اس میں بعض اہم اور بنیادی تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔

---

[۱] ڈاکٹر یوسف سرمست، ادب۔ نقد حیات، ۱۹۹۳ء، ص۔ ۱۶۹

دراصل اس تحریک کی وجہ سے اردو ادب عالمی ادب کے رجحانات
کی عکاسی کرنے لگا۔'' [۱]

یوسف سرمست نے ترقی پسند تحریک کے نقائص پر نظر ڈالتے ہوئے۔ پریم چند کی اہمیت بتائی ہے۔ان کے خیال میں ترقی پسند تحریک سے قبل بھی ہمارے یہاں پریم چند انسانیت اور سماجی مسائل کو پیش کر چکے تھے۔ چنانچہ ترقی پسند ادیبوں اور اور پریم چند کی تحریروں کا تقابل کرتے ہوئے انھوں نے ترقی پسند تحریک کی خامیوں کی نشاندہی کی ہے وہ لکھتے ہیں:

''پریم چند نے ہندوستانی زندگی اور اس کے بنیادی مسائل کے ذریعہ انسانیت اور ساری دنیا کے مسائل کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی۔ان کی تحریروں میں جو ترتیب و توازن اور مرکزیت تھی وہ ترقی پسندوں کو حاصل نہ ہو سکا کیونکہ یہ تحریک ہی عالمی مسائل کی گود میں پل کر بڑی ہوئی تھی۔ترقی پسند ادیب ہندوستان کے اہم اور بنیادی مسائل کو سمجھنے اور سُلجھانے سے پہلے عالمی مسائل میں اُلجھ کر رہ گئے۔'' [۲]

یوسف سرمست کے نزدیک نقاد اور فنکار کا رویہ بالکل الگ ہوتا ہے۔ان کا ماننا ہے کہ متضاد اور متصادم اعتقادات جب ہوتے ہیں تو نقاد کا رویہ کیا ہونا چاہئے۔اس حوالے سے فنکاری کی تخصیص اور تفہیم ممکن ہے یا نہیں۔ اعتقاد کا ٹکراؤ کس صورت میں پیدا ہوتا ہے اس کو سمجھنے کی ضرورت ہوتی ہے یا نہیں۔اگر نہیں ہے تو ہم ان کے عہد سے پہلے کے شاعروں کی عظمت و رفعت کو کس بناء پر قبول کریں گے۔ان اعتقادات اور نظریات کو جب ہم دیکھتے ہیں تو ہمیں یوں محسوس ہوتا ہے کہ:

''ترقی پسند تحریک کا رویہ اقبالؔ کے ساتھ جو کچھ رہا ہے اس پہ نظر

---

[۱] ڈاکٹر یوسف سرمست، بیسویں صدی میں اردو ناول، تیسرا ایڈیشن ۲۰۱۶ء، ص۔۲۴۷

[۲] ڈاکٹر یوسف سرمست، ادب۔نقد حیات، ۱۹۹۳ء، ص۔۵۵

ڈالنے سے پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ متضاد اور متصادم اعتقادات جب
ہوں تو نقاد کا رویہ کیا ہونا چاہئے۔ نقاد کا اعتقاد اور فنکار کا اعتقاد
بالکل متضاد ہو تب بھی فنکاری کی تخصیص اور تفہیم ممکن ہے یا نہیں۔
اعتقاد کا ٹکراؤ اور کس صورت میں پیدا ہوتا ہے اس میں سمجھوتے کی
کوئی صورت ہے بھی یا نہیں۔ اگر نہیں ہے تو پھر ہم اپنے عہد سے
پہلے کے شاعروں کی عظمت اور اہمیت کو کس بناء پر قبول کرتے ہیں
ان اعتقادات اور نظریات ہم سے بالکل الگ اور مختلف ہیں۔'' [1]

ترقی پسند ناقدین پر اپنا اعتراض جتاتے ہوئے اقبالؔ اور مارکسزم کے حوالے سے پروفیسر یوسف سرمست لکھتے ہیں:

''اقبالؔ اور اس کے شاعروں کے لے گویا ضروری ہوگیا تھا کہ وہ
مارکسزم پر ایمان لے آئیں۔ مارکسزم کو بھی تنقیدی نگاہ سے دیکھنا
اقبالؔ کا ایک ایسا کفر تھا۔ جسے ترقی پسند نقاد جیسے معاف کرنے پر کم
ازکم اُس زمانے میں تیار نظر نہیں آتے۔ اگر کوئی اس پر اعتماد نہیں
رکھتا تو وہ طرح طرح کے القاب سے نوازا جاتا۔ وہ رجعت پسند
کہلاتا تھا۔ وہ قدامت زدہ تھا اور وہ فاشسٹ تھا۔ اس طرح بالکل یہ
غیر ادبی اندازِ فکر کو اپناتے ہوئے ترقی پسند نقادوں نے کبھی یہ سوچنے
کی زحمت نہیں کی۔'' [2]

ترقی پسند تحریک کے حوالے سے اردو افسانے نے کافی ترقی کی۔ یہاں تک کہ اس عہد کو اردو افسانہ نگاری کا عہد آفریں کہا گیا۔ اس تحریک کے سایئے میں بہت سے بڑے افسانہ نگار سامنے آئے

---

[1] ڈاکٹر یوسف سرمست، ادب۔ نقد حیات، ۱۹۹۳ء، ص۔ ۲۱

[2] ڈاکٹر یوسف سرمست، ادب۔ نقد حیات، ۱۹۹۳ء، ص۔ ۲۴

جن میں منٹو، کرشن چندر اور حیات اللہ انصاری خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے اردو افسانہ نگاری میں بیحد اضافہ کیا۔ نیا اسلوب اور نئی کردار نگاری کو افسانے کے فن میں پیش کیا۔ اردو افسانہ کی روایت اور ارتقاء میں ترقی پسند تحریک نے کیا رول ادا کیا اس پر بحث کرتے ہوئے یوسف سرمست رقم طراز ہیں:

> ترقی پسند تحریک نے اردو افسانہ نگاری میں عہد آفریں کام کیا۔ ترقی پسند تحریک کے زمانے میں اور اس طرح زیر اثر اردو میں بہت بڑے بڑے افسانہ نگار سامنے آئے۔ حیات اللہ انصاری نے کئی اعلیٰ معیار کے افسانے لکھے۔ کرشن چندر نے بھی سینکڑوں افسانے لکھ کر اردو افسانوں میں اتنا اور ایسا اضافہ کیا......سعادت حسن منٹو اردو کا بہت بڑا اور بہت ہی منفرد افسانہ نگار ہے۔ منٹو کے افسانوں کی کردار نگاری نا قابل فراموش ہے۔ وہ بڑی باریک بینی اور جزئیات سمیت اپنے کرداروں کو پیش کرتے ہیں''۔[1]

5.2 ۔حلقہ ارباب ذوق

یورپ میں ۱۸۰۴ء میں ادب برائے ادب کی اصطلاح استعمال میں لائی گئی۔ اس اصطلاح نے صرف ادب پر زور دیا۔ ادب کو ہی پرکھنا اور جانچنا اس کا محور رہا۔ جن قلمکاروں نے اس کے لئے لکھا تو انہیں یہ ہدایت دی گئی کہ ادب کے لئے لکھیں تا کہ ادب ترقی کرے۔ ادب برائے ادب کی اصطلاح کی ابتداء کے بارے میں بات کرتے ہوئے یوسف سرمست اس سے وابستہ یوروپ کے اہم ناقدین پر یوں روشنی ڈالتے ہیں:

> ''ادب برائے ادب کی اصطلاح یوروپ میں ۱۸۰۴ء میں استعمال ہوئی۔ ''بن جامن کانسٹیٹ'' نے ''کانٹ'' کے سلسلے میں ادب برائے ادب کی اصطلاح کا ذکر کیا ہے۔ کانسٹیٹ اور میڈیم ڈی

---

[1] ڈاکٹر یوسف سرمست، اردو افسانہ نگاری میں کرشن چندر کی انفرادیت، ۲۰۱۲ء، ص۔۲۲

اسٹیل کی وجہ سے فرانس میں کانٹ کی جمالیات کا دور دورہ شروع ہوتا ہے۔ فرانسیسی ادیب گوتیر کے خیالات میں ''ادب برائے ادب'' کا واضح تصور ملتا ہے۔ وکٹر کاذن کے علاوہ وہ اس تحریک کا اہم علمبردار ہے''۔[1]

۱۹۳۹ء کی یہ تحریک حلقۂ ارباب ذوق، جس کا پہلا نام ''بزمِ داستان گویا'' تھا۔ اس تحریک کے زیر ادب میں وسعت آئی۔ ہر تحریک کو بامِ عروج ہوتا ہے لیکن اس درمیان کچھ لوگ تحریک کے خلاف بھی ہوجاتے ہیں۔ جیسے سردار جعفری نے اس تحریک کی سخت مذمت کی۔ اس نے حلقۂ ارباب ذوق میں شامل حضرات کو ہیئت، ابہام اور جنسیت پرست کہا۔ اس حوالے سے بات کرتے ہوئے پروفیسر یوسف سرمست نے کہا کہ حلقہ ارباب ذوق اور ترقی پسند تحریک کے درمیان نظریاتی اختلاف ہمیشہ قائم رہتا ہے۔ چنانچہ وہ سردار جعفری کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''سردار جعفری نے حلقۂ ارباب ذوق کی سخت مذمت کرتے ہوئے بھی حلقے کی بعض خوبیوں کا اعتراف کیا۔ انھوں نے حلقۂ ارباب ذوق سے تعلق رکھنے والوں کو ''ذہین'' کہا اور زیادہ منظّم ثابت کیا۔ سردار جعفری نے حلقے کے لوگوں کو ہیئت، ابہام اور جنس پرست کہا۔ اس کے علاوہ یہ بھی کہا کہ اس حلقے کی بنیاد یہ ہے کہ ''ادب کا سماج سے کوئی تعلق نہیں''۔ سردار جعفری نے حلقے کی رومانیت کو ''مجہول اور گندی قرار دیا اور حلقے کو جاگیردار اور بورژہ انحطاط کی گندگی کا بدرو'' کہا۔ یوں ترقی پسندوں اور حلقے کے مصنفین کے درمیان شدید اختلاف قائم ہوگیا۔ ''فن برائے فن اور فن برائے زندگی'' کا

---

[1] ڈاکٹر یوسف سرمست، ادب کی ماہیت، منصب اور تعریف، ۱۹۸۳ء، ص۔۹۹

یہ نظریاتی اختلاف کسی نہ کسی صورت میں ہمیشہ قائم رہتا ہے۔''[1]

5.3 ۔ کلاسیکی تحریک

جب علم کی بات کرتے ہیں تو بہت سارے علوم کی ابتداء یونان میں ہوئی۔اسی طرح ''کلاسک'' کا لفظ بھی پہلے یونان میں استعمال ہوا۔وہاں یہ لفظ یونانی ادب کے لئے ''کلاسیکل'' کے طور پر کیسے درج ہوا اس پر روشنی ڈالتے ہوئے یوسف سرمست نے بتایا کہ اس کا تعلق ادب سے نہیں تھا بلکہ وہاں کی سماجی زندگی سے تھا۔ان کے مطابق یونانی سماجی زندگی پانچ طبقات میں منقسم تھی اور "Classic" کہلاتا تھا۔پھر بتدریج اس کی شکل بدلتی گئی۔اسی طرح باقی زبانوں میں یہ لفظ استعمال ہونے لگا۔اس طرح کلاسیکیت کی تحریک کو سمجھانے سے پہلے وہ لفظ کلاسک سے متعلق تفصیلات یوں پیش کرتے ہیں:

> ''کلاسیکیت کی تحریک کو سمجھنے سے پہلے خود کلاسک کے لفظ کو سمجھ لینا ضروری ہے۔مغربی ادب میں کلاسک کا لفظ پہلے رواج پایا۔جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ دنیا کے بہت سے علوم کی ابتداء یونان سے ہوئی۔اسی طرح کلاسیکل لفظ بھی سب سے پہلے یونانی ادب کے لئے ہوا۔ابتداء میں اس لفظ کا تعلق ادب سے نہیں تھا بلکہ وہاں کی سماجی زندگی سے تھا۔یونان میں سماجی زندگی سے تھا۔یونان میں سماجی زندگی پانچ طبقات میں منقسم تھی۔ہر طبقہ "Classis" کہلاتا تھا۔لاطینی میں "Classis" کے معنی وہ جماعت گروہ یا طبقے کے ہیں،انگریزی لفظ "Class" اسی سے بنا ہے۔یونانی اور رومی سماج کا سب سے اعلیٰ یا اونچہ طبقہ "Classicus" کہلاتا ہے''۔[2]

---

[1] ڈاکٹر یوسف سرمست،ادب کا نوبل انعام ادبی یا سیاسی اور دوسرے مضامین ۲۰۱۰ء ص۔۱۷۱۔۱۷۲

[2] ڈاکٹر یوسف سرمست،نظری اور عملی تنقید،دسمبر ۲۰۰۲ء،ص۔۳۸

5.4 ۔ رومانی تحریک

رومانیت بھی کلاسیکیت کی طرح ادب کی ایک مشہور اصطلاح ہے ۔ پہلے پہل اس اصطلاح کی طرف غلط آ رائیں پیش کی گئی اور غلط فہمیاں پھیل گئیں ۔خاص طور پر جب یہ اصطلاح اردو میں استعمال میں لائی گئی تو اس کا دائرہ کار صرف حسن و عشق تک ہی محدود تھا ۔ایسا کچھ لوگوں کا ماننا ہے ۔حالانکہ یہ اصطلاح کثیر معنیٰ رکھتی ہے۔آ ہستہ آ ہستہ لوگ اس اصطلاح کو سمجھنے لگے اور بھر پور استعمال کرنے لگے۔ اس طرح رومانیت کی تعریف پیش کرتے ہوئے پروفیسر یوسف سرمست لکھتے ہیں:

> ''رومانیت بھی کلاسیکیت کی طرح ادب کی بہت ہی معروف ومقبول اصطلاح ہے ۔اس اصطلاح کے تعلق سے عام طور پر بہت سی غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں ۔خاص طور سے اردو میں اصطلاح کے تعلق سے ذہن صاف نہیں ہیں ۔بعض لوگ اسے صرف حسن و عشق تک محدود کرتے ہیں تو بعض کسی اور مفہوم تک ۔حالانکہ یہ بہت ہی وسیع اصطلاح ہے ۔ ایک مغربی نقاد لودوجے نے اس سے وابستہ کثیر معنوں کو سامنے رکھتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ ''رومانیت کے اتنی معنیٰ ہیں کہ اس کے کوئی معنیٰ ہی نہیں رہے ہیں''۔
>
> "Romanticism means so many things it means nothing." [1]

ہر تحریک ترقی کے منازل طئے کرتی اور ادب کے ساتھ ساتھ تحریک بھی دوسرے سانچوں میں ڈھل جاتی ہے جیسا کلاسیکیت دھیرے دھیرے نوکلاسیکیت ہوگئی ۔نوکلاسیکیت میں ''عقل'' کو اعلیٰ سمجھا جاتا ہے۔رومانیت میں جذبے کو اہمیت دی جاتی ہے۔اسی لئے یہ کہنا صحیح ہے کہ جذبہ سے ہی حضرت ابراہیمؑ

[1] ڈاکٹر یوسف سرمست ،نظری اور عملی تنقید، دسمبر ۲۰۰۲ء ،ص۔۵۳

آ گ میں کود پڑے ۔ رومانیت میں جذبے کو حقیقی معنوں کے طور پر استعمال کیا گیا ۔نوکلاسیکیت اور رومانیت میں عقل اور جذبے کو کس طرح اہمیت دی گئی ہے اس تعلق سے پروفیسر یوسف سرمست لکھتے ہیں:

''نوکلاسیکیت میں ''عقل'' کو مقدم سمجھا جاتا تھا۔ رومانیت میں جذبے کو اہمیت دی گئی۔ ''عقل محوتماشائے لب بام'' ہوجاتی ہے اور ''جذبہ'' بے خطر آتشِ نمرود میں کود پڑتا ہے۔ ہر کام میں جذبے کی قوت ہی اس کو سرانجام دینے میں اہمیت رکھتی ہے ۔ اس لئے فنکاری میں عقل کو دوسرا مقام حاصل ہے اور جذبے کو پہلا ۔ رومانیت میں اس بات پر پورا ایقان ملتا ہے کہ ''معجزہ فن'' کی نمود ''خون جگر'' سے ہوسکتی ہے۔اس لئے وہ ''عقل'' کونہیں ''جذبے'' کومقدم سمجھتے ہیں۔'' [1]

---

[1] ڈاکٹر یوسف سرمست ،نظری اور عملی تنقید، دسمبر ۲۰۰۲ء،ص۔۵۶

مجموعی جائزہ

پروفیسر یوسف سرمست بحیثیت محقق وناقد سے اردو ادب میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ان کی تحقیقی وتنقیدی تصانیف اردو ادب میں اعتبار حاصل کر چکی ہیں۔خصوصاً تنقید نگاری میں انہوں نے ایک منفرد اور غیر معمولی انداز نقد اختیار کر کے اپنے مخصوص اسلوب اور زبان و بیان میں ادب پاروں کی تقسیم کی ہے۔انہوں نے شعر وادب کو پڑھ کر قدیم وجدید کو نئے اردو پرانے تقاضوں کے تحت جانچا اور پرکھا اور اپنی تحقیقی وتنقیدی تصانیف میں اپنے نقطہ نظر کو عملی تنقید کے ذریعہ پیش بھی کیا ہے۔ان کی تحقیقی وتنقیدی تصانیف میں ''عرفانِ نظر''، ''ادب۔نقد وحیات''، ''پریم چند کی ناول نگاری''، ''ادب کی ماہیئت، منصب اور تعریف''، ''تحقیق وتنقید''، ''نظری اور عملی تنقید''، ''دکنی ادب کی مختصر تاریخ''، ''ادب کا نوبل انعام ادبی یا سیاسی اور دوسرے مضامین''، ''اردو افسانہ نگاری میں کرشن چندر کی انفرادیت'' اور ''بیسویں صدی میں اردو ناول'' اردو ادب میں خاصی اہمیت کی حامل ہیں۔

پروفیسر یوسف سرمست کی ولادت ۲۸/ دسمبر ۱۹۳۶ء میں بشیر باغ حیدرآباد میں ہوئی۔ یوسف سرمست کا اصل نام یوسف شریف الدین ہے۔یوسف سرمست نے ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی۔بعد میں مدرسہ پھر اسکول گئے۔اس کے بعد سٹی کالج میں داخلہ لیا اور اچھے نمبرات سے انٹرمیڈیٹ اور ہائی اسکول کی تعلیم حاصل کی۔پھر سٹی کالج سے بی۔اے پاس کیا۔اس کے بعد عثمانیہ یونیورسٹی سے منسلک ہوئے۔یہاں انہوں نے ایم۔اے اردو کی ڈگری امتیازی نمبرات سے حاصل کی۔پھر اسی یونیورسٹی سے پی ایچ۔ڈی کی سند بھی لی۔اس طرح سے بحیثیت لکچرر وہ اسی شعبہ سے وابستہ ہوئے اور درس وتدریس میں مشغول رہے۔لکچرر سے ترقی کرتے ہوئے پروفیسر ہوئے ہیں۔بحیثیت استاد انہوں نے کئی طالب

علموں کی بہترین رہنمائی کی۔ وہ نرم دل، محبی و مشفق استاد تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے طالب علموں کو محبت سے پڑھاتے تھے۔ بلکہ انہیں آگے بڑھنے کی تربیت بھی کرتے تھے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر میمونہ مسعود کہتی ہیں:

''پروفیسر یوسف سرمست ایک نرم دل، خوش مزاج اور شریف النفس انسان ہیں۔ وہ نرم لہجے میں ہر وقت باتیں کرتے ہیں۔ وہ کلاس میں اکثر ہم لوگوں کو نصاب کے علاوہ نئی معلومات سے آگاہ کرتے تھے۔ انہوں نے ہمیشہ شاگردوں کی قدر کی ہے اور اپنے آگے چلانے کی راہیں بنائی ہیں۔''[1]

پروفیسر یوسف سرمست دور حاضر کے ایسے نقاد ہیں جنہوں نے دورانِ تحقیق ادب پاروں کو صحیح نگاہ سے دیکھ کر غیر جانبداری سے کام لیا ہے۔ وہ جب کسی مسئلے کو پیش کرتے ہیں تو وہ مسئلے کی تہہ تک جا کر اس کا حل بھی تلاش کر کے پیش کرتے ہیں۔ ادب میں زبان ایسی استعمال کی جاتی ہے جو بیک وقت کسی بات کو ظاہر بھی کرتی ہے اور چھپاتی بھی ہے۔ کیوں کہ زبان اور خاص طور پر ادبی زبان استعاراتی ہوتی ہے۔ ادبی زبان میں جذبات و احساسات کو متاثر کرنے کی صلاحیت اور قوت ہوتی ہے۔ اس لیے وہ ادب کی تفہیم کے لیے تاثراتی و جمالیاتی پہلوؤں کو ضروری خیال کرتے ہیں۔ تا کہ ادیب یا شاعر کے ادبی کیفیات تک رسائی حاصل کرنے کا ذریعہ بھی یہی تاثرات ہوتے ہیں۔

اپنی نظری تنقید میں وہ ادب میں تخیل کی اہمیت کو بھی تسلیم کرتے ہیں۔ ان کے مطابق انسان کی باطنی زندگی یعنی اس کے جذبات و احساسات کی پیش کشی کے لیے فن کار کو تخیل سے کام لینا پڑتا ہے۔ انہوں نے اپنی تنقید میں تحقیق اور تنقید کی اہمیت کو بھی تسلیم کیا ہے۔ ان کے نزدیک تحقیق اور تنقید کا آپس میں گہرا رشتہ ہے۔ انہوں نے تحقیق و تنقید کی مختلف تعریفیں پیش کرتے ہوئے ان کے آپسی رشتے پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ یوسف سرمست جب ادب میں شدت تاثر کے اظہار کو ضروری خیال کرتے ہیں

---

[1] شخصی انٹرویو، ڈاکٹر میمونہ مسعود، عثمانیہ یونیورسٹی آف حیدرآباد، تاریخ ۹ مئی ۲۰۱۷ء

وہیں وہ یہ بھی مانتے ہیں کہ ادب میں زندگی کی عکاسی بھی ضروری ہے۔انہوں نے ادب کے زندگی سے اٹوٹ رشتے پر بار ہا زور دیا ہے۔ وہ ادب کے مطالعے میں اس بات کے بھی قائل نظر آتے ہیں کہ ادب میں ادیب کا عہد اور اس کے عہد کے معاشرتی، سیاسی و تہذیبی حالات کی عکاسی بھی ضروری ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ ادب کے مطالعے میں نفسیاتی تجزیے کو بھی ضروری خیال کرتے ہیں۔نفسیاتی تجزیے سے مراد ان کے نزدیک تحلیل نفسی نہیں ہے بلکہ واقعات اور کرداروں کا ایسا بیان ہے جس سے نفسیاتی محرکات کی طرف ہمارا ذہن منتقل ہوتا ہے۔ان تمام باتوں سے ان کے انداز نقد کا پتہ ملتا ہے یعنی وہ کسی ایک چیز پر اصرار نہیں کرتے بلکہ ادب کے مطالعے کے لیے جتنے پہلو ممکن ہو سکتے ہیں۔ان کو استعمال کرنے پر زور دیتے ہیں۔

غرض نظریاتی تنقید میں وہ ادب کے جمالیاتی پہلوؤں کی تلاش و جستجو کے ساتھ ساتھ تاثرات کے شدت سے اظہار کو ضروری خیال کرتے ہیں۔ساتھ ہی وہ مصنف کے عہد، اس کے نفی اثرات، اس کے عہد کے حالات اور ماحول کے علاوہ تہذیبی و اخلاقی قدروں پر بھی زور دیتے ہیں۔علاوہ ازیں انہوں نے نفسیاتی عوامل کی اہمیت کو بھی تسلیم کیا ہے۔

یوسف سرمست کے یہاں عملی تنقید کے نمونے بھی ملتے ہیں۔اصناف ادب پر عملی تنقید کی ہے۔ شعراء ادیبوں اور ادب کی مختلف تحریکوں پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔اس سلسلے میں ''بیسویں صدی میں اردو ناول'' ان کی اہم کتاب ہے۔ جو اردو ناول نگاری کی تاریخ کے سلسلے میں اہمیت رکھتی ہے لیکن صنف ناول کے بارے میں بھی جگہ جگہ اس میں اظہار خیال کیا گیا ہے۔ناول کے تعلق سے پروفیسر یوسف سرمست کا یہ ماننا ہے کہ ناول مغرب سے برآمد کی ہوئی صنف نہیں ہے بلکہ ہندوستان کے مخصوص حالات کی بنا پر یہاں مروج ہوئی ہے۔اس بات کو وہ یوں ظاہر کرتے ہیں ''اگر چہ ناول کا لفظ اور اس کی ہیئت انگیزی ادب کے ذریعہ ہندوستان آئی لیکن اصل میں ہندوستان کے وہ مخصوص حالات تھے جنہوں نے یہاں کے ادیبوں کو ناول نگاری کی طرف راغب کیا۔''

انہوں نے اس سلسلے میں تفصیل سے بحث کی ہے اور بتایا کہ حقیقت میں یہ ایک ضرورت تھی کہ

کیوں کہانی ہر زمانہ کے ادب کی مقبول ترین صنف رہی ہے۔ اس مقبولیت کو پیش نظر رکھ کر ہندوستان کے ادیبوں نے زندگی کی حقیقتوں اور اپنے خیالات کو قصوں میں سمونا شروع کیا۔

اسی لیے ادبی پس منظر کے عنوان کے تحت نذیر احمد اور سرشار کی ناول نگاری کا بھی جائزہ لیا ہے۔ انیسویں صدی کے اہم ناول نگاروں میں پہلا نام نذیر احمد کا آتا ہے ویسے تو اردو کے اولین ناول نگار کے تئیں ہمیشہ اختلافات رائے ملتی ہے۔ بعضوں کے نزدیک نذیر احمد اولین ناول نگار ہیں بعض ناقدین سرشار کو اولیت دینے چاہتے ہیں لیکن یوسف سرمست نے اپنی کتاب ''بیسویں صدی میں اردو ناول'' میں دلیل کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ ''مراۃ العروس'' اردو کا پہلا ناول ہے اور نذیر احمد ہی اردو کے پہلے ناول نگار ہیں۔

انہوں نے ناول کی مختلف اقسام پر بھی روشنی ڈالی ہے اور اردو ناولوں سے اس کی مثالیں پیش کرتے ہوئے ان پر بحث بھی کی ہے۔ ناول کے علاوہ انہوں نے صنف افسانہ پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ اس کے بعد انشائیہ کے حوالے سے انہوں نے بتایا ہے کہ انشائیہ کا اسلوب اگر چہ شگفتہ، سلیس، سادہ اور نرم و نازک ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود انشائیہ میں فلسفہ، حکمت اور سائنس جیسے موضوعات بھی زیر بحث آجاتے ہیں۔ اس کے علاوہ یوسف سرمست کی عملی تنقید میں شعراء اور ادیبوں پر بھی اظہار خیال ملتا ہے۔ شعراء میں وَلیؔ، میرؔ، مصحفیؔ، غالبؔ، مومنؔ، اقبالؔ، فیضؔ اور مخدومؔ محی الدین کی شاعری پر اپنے خیالات پیش کرتے ہوئے ان کی شاعری اور اسلوب کی انفرادیت پر خصوصی بحث کی ہے۔

پروفیسر یوسف سرمست نے کئی نثری اصناف ادب پر تنقیدی رائے پیش کی ہے جیسے ناول، افسانہ، انشائیہ، خاکہ، تبصرہ، خطوط اور مزاح نگاری وغیرہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ شاعروں ادیبوں اور محققین و ناقدین کے خیالات پر بھی اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ پروفیسر یوسف سرمست نے جن ادیبوں اور نقادوں پر تنقید کے نمونے پیش کیے ہیں۔ ان میں نذیر احمد، پریم چند، کرشن چندر، بیدی، قرۃ العین حیدر وغیرہ کے نام فکشن پر تنقید کے سلسلے میں ملیں گے اس کے علاوہ غیر نثری اصناف پر لکھنے والوں میں مولانا ابوالکلام آزاد، نیاز فتح پوری، مرزا غالب، مجتبیٰ حسین کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ محققین میں

گارساں دتاسی کی تحقیقی خدمات پر اظہار خیال کیا ہے اور ان کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے۔ ناقدین میں الطاف حسین حالی اور کلیم الدین احمد ہیں جن پر انہوں نے تنقید کی ہے۔ اس کے علاوہ اردو ادب کی تحریکوں پر بھی ان کے تنقیدی آرا ملتی ہیں۔

یوسف سرمست کی تنقید میں وضاحت وصراحت ہے وہ نظریاتی تنقید ہو یا عملی تنقید اپنے مطالعات میں اپنی آرا کو مدلل اور وضاحت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ شارب ردولوی نے ایک انٹرویو میں ان کی تنقید نگاری پر اپنی رائے یوں دی ہے:

> ''یوسف سرمست ایک اعلی پایہ نقاد ہونے کے ساتھ ساتھ محقق کا درجہ بھی رکھتے ہیں۔ وہ بات کو پوری وضاحت وصراحت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ ''بیسویں صدی میں اردو ناول'' ان کی اہم کتاب ہے جس کے مطالعہ سے انداز ہوتا ہے کہ وہ ناول کے حوالے سے کافی مطالعہ رکھتے ہیں۔ میرے خیال میں وہ ترقی پسند تحریک کے عظیم نقادوں میں شمار ہوتے ہیں۔''[1]

شارب ردولوی کی اس رائے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ترقی پسند تحریک کے ناقدین میں اہمیت رکھتے ہیں لیکن ان کی تحریروں کے مطالعے سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ وہ ترقی پسند تحریک کے اچھے عناصر سے متاثر ہیں اور وہ ان کی انتہا پسندی کو پسند نہیں کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ترقی پسند تحریک کے اعتدال پسند ناقدین میں ہم انہیں جگہ دے سکتے ہیں۔

ان کی تنقید کے مجموعی مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ تنقید میں کسی ایک بات پر اصرار نہیں کرتے بلکہ تنقید کرتے وقت فن پارے کی خوبیوں اور خامیوں کا مطالعہ اعتدال سے کرتے ہیں۔ ان کی تنقید کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ صرف ایک نظریہ کی اہمیت کو تسلیم نہیں کرتے بلکہ ادب کے مطالعے کے جتنے پہلو ہو سکتے ہیں ان کی طرف اشارے کرتے ہیں اور انہیں ادب کے مطالعے کے لیے ضروری خیال کرتے

---

[1] شخصیت انٹرویو، پروفیسر شارب ردولوی، دوران سمینار حیدرآباد، ۹ فروری ۲۰۱۷ء

ہیں۔وہ مغربی اثرات کو آنکھ بند کر کے قبول کرنے پر بھی اپنی ناراضگی جتاتے ہیں بلکہ وہ ادب میں مشرقی اقداراور روایات کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں۔ان کی تنقید میں تاثراتی، جمالیاتی، تاریخی وسماجی اور تہذیبی پہلوؤں پر زور ملتا ہے۔وضاحت وصراحت بھی ان کی تنقید کا خاص وصف ہے۔غرض معروضی نقطہ نظر سے وہ ادب کے مطالعے پر زور دیتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کی تنقید آرا کی روشنی میں ہم انہیں اردو کے سائنٹفک ناقدین میں بجا طور پر جگہ دے سکتے ہیں۔

کتابیات

کتابیات

مصنف کی کتابیں

۱۔ عرفان نظر، مینارک بک ڈپو، چارکمار، حیدرآباد، دسمبر ۱۹۷۷ء، باراول

۲۔ ادب کی ماہیئت، مصنف اور تعریف، تمکین سرمست اکیڈیمی، حیدرآباد، اگست ۱۹۸۳ء

۳۔ ادب۔ نقد حیات، آل انڈیا اردو ریسرچ اسکالر کونسل، حیدرآباد، دسمبر ۱۹۹۳ء

۴۔ تحقیق وتنقید، آل انڈیا اردو ریسرچ اسکالر کونسل، حیدرآباد، مارچ ۱۹۹۹ء

۵۔ نظری اور عملی تنقید، آل انڈیا اردو ریسرچ اسکالر کونسل، حیدرآباد، دسمبر ۲۰۰۲ء

۶۔ دکنی ادب کی مختصر تاریخ، آل انڈیا اردو ریسرچ اسکالر کونسل، حیدرآباد، دسمبر ۲۰۰۶ء

۷۔ ادب کا نوبل انعام۔ ادبی یا سیاسی اور دوسرے مضامین، ادارۂ شعر وحکمت، پنجہ گٹہ، حیدرآباد، دسمبر ۲۰۱۰ء

۸۔ اردو افسانہ نگاری میں کرشن چندر کی انفرادیت، ادارۂ شعر وحکمت، پنجہ گٹہ، حیدرآباد، ۲۰۱۲ء

۹۔ بیسویں صدی میں اردو ناول، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۱۶ء

دیگر تصانیف

۱۔ آمنہ تحسین ڈاکٹر، حیدرآباد اردو ادب کی تحقیق، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۱۰ء

۲۔ ابوالکلام قاسمی، ترجمہ، ناول کا فن، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ایڈیشن ۲۰۱۵ء

۳۔ خلیق انجم، متنی تنقید، انجمن ترقی اردو (ہند)، دہلی دوسری اشاعت، ۲۰۰۶ء

۴۔ سید احتشام حسین، اردو ادب کی تنقیدی تاریخ، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی، دسویں طباعت، ۲۰۱۶ء

۵۔ علی عباس حسینی، اردو ناول کی تاریخ اور تنقید، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ایڈیشن ۲۰۱۱ء

۶۔ قمر رئیس ڈاکٹر/ خلیق انجم ڈاکٹر، اصناف ادب اردو، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ۔ ایڈیشن ۲۰۱۳ء

۷۔ محمد احسن فاروقی ڈاکٹر/ سید نورالحسن ہاشمی ڈاکٹر، ناول کیا ہے، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، دوسرا ایڈیشن، ۲۰۱۱ء

۸۔ نورالحسن نقوی پروفیسر، فن تنقید اور اردو تنقید نگاری، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، دوسرا ایڈیشن ۲۰۱۳ء

۹۔ نورالحسن نقوی پروفیسر، تاریخ ادب اردو، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۱۰ء

۱۰۔ وحید قریشی ڈاکٹر، متربہ، مقدمہ شعر و شاعری، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ایڈیشن، ۲۰۱۱ء

۱۱۔ وقار عظیم، داستان سے افسانے تک، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ایڈیشن ۲۰۰۹ء

انٹرویوز

۱۔ شخصی انٹرویو، پروفیسر شارب ردولوی، حیدرآباد، ۹/ فروری ۲۰۱۷ء

۲۔ شخصی انٹرویو، ڈاکٹر میمونہ مسعود، عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد، ۹/ مئی ۲۰۱۷ء